قومی اتفاق

سرسید احمد خان

پیدائش ۱۸۱۷ء۔ وفات ۱۸۹۸ء

تعارف مصنف: سرسید احمد خان دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام میر متقی تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی بعدازاں ۱۸۳۵ء میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر سید الاخبار جاری کیا۔ ۱۸۳۸ء میں سرسید سرشتہ دار کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ اُن کی سرکاری ملازمت کا سلسلہ ۱۸۷۵ء تک قائم رہا۔ ملازمت سے سبکدوش ہو کر انھوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا۔ اس سے قبل انھوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس نے مردہ دلوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ سرسید کا اسلوب تحریر ابتداً قدیم رنگ میں تھا۔ بعدازاں اُن کی زمانہ شناس شخصیت نے محسوس کر لیا کہ مردہ دل قوم میں زندہ دلی کی لہر پیدا کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔ سرسید احمد خان کو جدید اردو نثر کا بانی کہا جاتا ہے، سرسید نے اپنی تحریر کو معاشرتی اصلاح کے لیے استعمال کیا۔ اُن کے پیش نظر مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی تھی۔ وہ اردو نثر میں ایک نئی طرز کے موجد ہیں۔ انھوں نے ادب کو درباروں سے نکال کر تعلیم گاہوں اور متوسط طبقے کے دل و دماغ تک پہنچا دیا۔ انھوں نے اس سے زندگی کی رہنمائی کا کام لیا۔ اور اردو نثر کو اس قابل بنا دیا کہ وہ پیچیدہ مسائل کو صفائی اور سادگی کے ساتھ بیان کر سکے۔ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ اصلاحی تحریک ہے جس نے نہ صرف اردو زبان کو فائدہ پہنچایا بلکہ مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں بھی ترقی حاصل ہوئی۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
حبل المتین	مضبوط رسی یعنی کلمہ طیبہ	نیست و نابود	تباہ و برباد، معدوم
العروۃ الوثقیٰ	مضبوط گرفت یعنی اللہ کی رسی کو مضبوط سے تھامنا	یک جہتی	اتفاق
بہ ایں ہمہ	اس سب کے ساتھ	فروعی مسائل	ضمنی، جزوی، غیر اہم یا معمولی مسائل
جمعیت	اکٹھا پن یعنی جماعت، گروہ	عداوت و نفاق	دشمنی اور نا اتفاقی
یکتائی	وحدت	مُبدّل	تبدیل
مقدس	پاک	حیلے	بہانے
تکفیر	کافر کہنا	ابنائے جنس	ایک ہی جنس کے یعنی ہم قوم
اعتقاد	یقین یا عقیدہ	اَمر	کام

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ضرر	تکلیف	اعانت	مدد
تمدنی امور	مل کے رہنے کی باتیں	ہم سائے	پڑوسی
جزو	حصہ	ہم سائگی	پڑوس
تمدن و معاشرت	آپس میں مل جل کر زندگی گزارنا	تنازعات	جھگڑے
طبائع	طبیعت کی جمع۔ عادتیں	نَسْياً مَنْسِياً	بالکل، بھولا بسرا۔ فراموش

مرکزی خیال: اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے جس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے درمیان رنگ، نسل، قومیت، زبان کے تمام امتیازات مٹا کر انھیں ایک روحانی رشتے میں جوڑ دیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ لوگوں نے اس آفاقی تعلیم کو فراموش کر کے خود کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر لیا ہے۔ جس کا خمیازہ ہمیں قومی زوال کی صورت میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ مسلم قوم کو ترقی کے لیے کوشاں رہنا چاہیے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ہمیں قومی اتفاق اور قومی ہمدردی کو ہر طرح کے منفی جذبے پر فوقیت دینا ہوگی۔ تب ہی ترقی ہمارے لیے ممکن ہوگی۔

خلاصہ: سرسید احمد خان لکھتے ہیں کہ تمام قومی رشتے، تمام قومی سلسلے روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے ہیں اور کلمہ پاک کی برکت سے ایک نیا روحانی بلکہ خدائی اور قومی رشتہ قائم ہو گیا ہے۔ دین اسلام کو کسی نسل، ذات پات، رنگ و شناخت سے غرض نہیں، بلکہ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔

سرسید کو افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں اخوت اور دوستی کو پس پشت ڈال کر حسد اور نفاق میں مبتلا ہیں۔ شیطان کی چال نے ہمیں ایک قوم رہنے نہیں دیا ہے۔ جب کہ اتفاق اور یکجہتی کا مظاہرہ کر کے ہم ترقی کی منزل پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ انفرادی نظریات و اختلافات سے خود کو بالاتر رکھ کر بھی اتفاق اور یکجہتی کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی وضاحت سرسید یوں کرتے ہیں کہ ایک آدمی کے اعمال و افعال ہیں جس کا وہ خود ذمہ دار ہے، اور وہ اس بارے میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ لیکن اس سے بڑھ کر بھی ہمارا اس سے تعلق ہے وہ انسانیت کا ہے۔ انسانیت کی بنیاد پر ہمیں ایک دوسرے کی مدد اور خیر خواہی کرنا چاہیے جس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ سکتا ہے جو نہ صرف قومی ہمدردی کے جذبات سے بھرپور ہوگا، بلکہ قومی ترقی کی اہم اساس بھی ہوگا۔ سرسید اس خیال کی بھی تردید کرتے ہیں کہ قوموں کے افراد کی مختلف طبیعتوں اور رجحانات کے باعث آپس میں اتفاق ناممکن ہے۔ سرسید کا کہنا ہے کہ یہ اصول و ضابطہ انفرادی و شخصی اتفاق کے بارے میں تو مقرر کیا جا سکتا ہے لیکن قومی اتفاق کی راہ میں اس اصول و ضابطے کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیوں کہ قومی نفع اور قومی نقصان پر سب ہی متفق ہوتے ہیں۔ قوم کی مضبوطی قوم میں موجود افراد کی مضبوطی ہوا کرتی ہے۔

سرسید قوم کی بے حسی پر سخت چیں بہ جبیں ہیں۔ وہ مسلمانوں کے قومی زوال کا ایک اہم سبب قومی مفاد پر چند فروعیات اور ذاتی اغراض کی ترجیح کو بتلاتے ہیں جس نے قوم و ملت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

حوالہ سبق: یہ اقتباس شامل نصاب سبق "قومی اتفاق" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف سرسید احمد خان ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

اہم اقتباسات کی تشریح

(۱) "مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں، مگر مثل بردرانِ یوسف کے ہیں۔ آپس میں دوستی اور محبت، یک دلی اور یک جہتی بہت کم ہے۔ حسد، بغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نا اتفاقی ہے۔"

تشریح: سرسید ایک مصلحِ قوم تھے۔ قوم کا درد اُن کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔ مذکورہ بالا اقتباس میں وہ نہایت دکھی دل کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ ہم سب انسانی رشتے سے منسلک ہو کر، نیز آسمانی تعلیمات کو جان کر بھی ایک دوسرے سے حسد، دشمنی اور دلی نفرت رکھتے ہیں۔ ہمارا حال حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی مانند ہو گیا ہے جو دوسرے کو نقصان پہنچانے کی فکر میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ آج یہ حالت ہے کہ دل میں خیر خواہی کے جذبات کم اور اتفاق و محبت کا فقدان ہے۔ حقیقی بھائی چارگی کی جگہ نا اتفاقی عام ہے۔ نا اتفاقی کی بنا پر مسلمان رشتۂ اخوت کو توڑ کر فرقوں، گروہوں اور ذاتوں میں بٹ گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہم انسانیت اور باہمی ہمدردی سے دور ہیں۔ یہ سراسر قومی خسارہ ہے اگر سمجھیں!

(۲) "ان نا اتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے۔ قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی اُمور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نا اتفاقی نے بہت کچھ اثرِ بد پہنچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے مُبدل کریں۔"

تشریح: کسی بھی قوم میں جب کمزوری آتی ہے تو اس کا ایک اہم سبب نا اتفاقی ہوا کرتا ہے۔ ہمیں بھائی بھائی بن کے رہنے کی تعلیمات دی گئی ہیں۔ لیکن صد افسوس کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے اخوت کے رشتے کو چھوڑ کر ہم نے اپنے ہی بھائیوں سے رنگ و نسل، مسلک و قومیت کی بنیاد پر نفرت اور حسد کرنا شروع کر دیا ہے جس کا کہیں حکم نہیں۔ بلکہ گناہ عظیم ہے۔ اس گناہ کا عذاب ہم پر یہ نازل ہوا ہے کہ آپس میں پھوٹ اور نا اتفاقی کا دور دورہ ہے۔ قوم کی قوت، طاقت اور شوکت میں ہر آنے والے والے روز کمی آتی جارہی ہے۔ برا ہو اس نا اتفاقی کا، کہ جس کے مضر اثرات اس قدر پھیل گئے ہیں کہ قومی ہمدردی ایک بے معنی شے بن کے رہ گئی ہے، اور وہ دن دیکھنے پڑے ہیں کہ قوم ترقی کے بجائے زوال آمادہ ہے۔ پس ہماری اولین ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ قوم کی ترقی کی خاطر آپس میں محبت اور اتفاق پیدا کریں۔ نفاق کے بجائے یکجہتی کو اختیار کریں۔ بظاہر یہ ایک مشکل کام ہوگا، لیکن اس کے صلے میں قوم ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گی۔ ہماری ترقی اور فلاح بھی قوم کی کامیابی سے وابستہ ہے۔

(۳) "اتفاق کے قائم رکھنے کی، جس کی ہم کو ضرورت ہے، ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر سے الفاظ میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی جو کچھ بھلائی ہو یا برائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ساتھ ہے۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے، نہ بیٹا، نہ دوست، نہ آشنا اور نہ قوم۔ پس ہم کو اس بات سے، جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ سے تعلق نہیں ہے، کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے۔"

تشریح: اتفاق کو قائم رکھنے کے لیے سرسید نے ایک اہم رہنمائی عطا کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لوگوں کے درمیان اتفاق واتحاد کی فضا اور قوموں میں یگانگت کا ماحول یوں بھی پیدا نہیں ہو پاتا کہ ہم ایک دوسرے کو عقائد ونظریات کے ترازو میں تولتے رہتے ہیں۔ عقیدہ اور نظریے کے اختلاف کو اتنا زیادہ ہوا دیتے ہیں کہ نفرت اور دوریاں پیدا ہو جاتی ہیں، نتیجتاً قوم نہ صرف کمزور ہو جاتی ہے، بلکہ اس میں انتشار اور پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ اس ضمن میں سرسید کا مشورہ ہے کہ اختلافات فطری چیز ہیں۔ اختلافات کے باوجود قومی اتفاق اس طرح قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس بات پر غور کریں کہ انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک حصہ جو اسکے ذاتی نظریات وعقائد اور خدائی معاملات سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہ خود ہے اور خدا کے سامنے خود جواب دہ ہوگا۔ ہم اس سے سروکار نہ رکھیں۔ اس طرح تنازعات اور اختلافات کی جڑ کٹ سکتی ہے۔ البتہ انسانی زندگی کا دوسرا پہلو جو انسان اور معاشرت سے جڑا ہے اس کو پیش نظر رکھ کر ہم ایک دوسرے کی خدمت کریں۔ بنی نوع انسان جسے سرسید نے ابنائے جنس قرار دیا ہے، کے ساتھ رواداری، ہمدردی اور اتحاد کا ماحول پیدا کریں تو قومی اتفاق کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔

(۴) "نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و نقصان نہیں۔ جو حصہ آپس کی محبت، باہمی دوستی، ایک دوسرے کی اعانت، ایک دوسرے کی ہمدردی ہے، جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ، قومی اتفاق، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے جو قومی ترقی کے لیے پہلی منزل ہے۔"

تشریح: سرسید چاہتے ہیں کہ انسانوں میں باہم سچی محبت اور حقیقی ہمدردی کے جذبات ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کسی کے ذاتی نظریات سے الجھنے اور اس سے نفرت کرنے کے بجائے وسیع تر فائدے کو سامنے رکھیں۔ وہ فائدہ ہے قومی ترقی کا۔ قومی ترقی دراصل باہمی اتفاق کا ثمر ہوا کرتی ہے۔ قومی اتفاق اس وقت پیدا ہوگا کہ ہمارا جذبہ ایک دوسرے کی بے لوث خدمت اور نیک برتاؤ کا ہو۔ آپس کی محبت، ایک دوسرے کی مدد ہمارا نصب العین ہو۔ ایک دوسرے کی غم خواری اور خیر خواہی ہمارا مقصدِ واحد ہو۔ اجتماعی کوششوں سے قوم کے اندر ہمدردی کی روح پیدا کرنا دشوار کام ہرگز نہیں ہے۔ ہم انسان ایک دوسرے کا سہارا بن کر اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں جہاں سے کسی قوم کی ترقی کا آغاز ہوتا ہے۔ عظیم فائدے کے حصول کے لیے ہمیں عامیانہ طرزِ عمل کو ترک کرنا ہوگا۔ اس میں قوم کی بہتری، فلاح اور کامیابی تو پوشیدہ ہے ہی، نیز اللہ تعالیٰ کا منشا بھی یہی ہے۔

(۵) "اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔ کسی کو بہ جز ذاتی منفعت کے قومی بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے۔ اگر کوئی کچھ

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی ذاتی غرض مدنظر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔"

تشریح: سرسید کہتے ہیں کہ دن بہ دن ہماری قوم جو پستی کی دلدل میں دھنستی چلی جارہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد و اتفاق کی کوشش تو رہی ایک طرف؛ کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔ اپنے ذاتی فائدے، ذاتی تعیشات اور انا کی تسکین میں ہر شخص گھرا ہوا ہے۔ جو کوششیں ہو رہی ہیں، اس میں اپنی آسودگی اور اپنی ہی غرض مدِ نظر ہے۔ جو کوئی کام کرتا بھی ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کو کتنا نفع پہنچ سکتا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو قوم کا درد کس کو ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ قوم کے ہر فرد میں یہ جذبہ پیوست ہو کہ وہ اپنا ذاتی خسارہ برداشت کرلے گا، لیکن قومی اتفاق اور قومی منفعت پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرے گا۔ نیکی کا یہ خیال مفقود ہونے کی وجہ سے ہم بے برکتی کا رونا روتے رہتے ہیں۔

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے۔

(الف) پرانے زمانے میں لفظ "قوم" سے کیا مراد لی جاتی تھی؟

(جواب) قدیم زمانے میں مشہور بزرگ کی نسل سے وجود میں آنے والے انسان یا کسی ملک کے رہنے والے لوگ ایک قوم کہلاتے تھے۔

(ب) اسلام نے تفرقۂ قومی کو مٹا کر کون سا رشتہ قائم کیا؟

(جواب) اسلام کی برکت ہے کہ اس نے بتایا کہ قومیت کی بنیاد پر فخر کو مٹا کر تمام کلمہ گو ایک لڑی میں خود کو پرو دیں۔ اس کے نتیجے میں ایسا روحانی رشتہ پیدا ہوتا ہے جو تمام نسلی و قومی رشتوں پر غالب ہے۔

(ج) سرسیّد کے نزدیک قومی ترقی کا اولین مرحلہ کیا ہے؟

(جواب) سرسید کے نزدیک قومی ترقی کے لیے اولین مرحلہ یہ ہے کہ ہم ہر طرح کی عصبیتوں، دشمنیوں اور آپس میں پڑنے والی پھوٹ سے دستبردار ہوں۔ باہم محبت کا مظاہرہ کر کے اتفاق اور یکجہتی سے رہیں۔

(د) یکتائی و یک جہتی سے سرسیّد کی کیا مراد ہے؟

(جواب) یکتائی اور یک جہتی کا مظاہرہ کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ذاتی نظریات اور دلی اعتقادات کو خیر باد کہہ دیں۔ بلکہ سرسید کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ اختلاف ایک فطری چیز ہے جسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اختلافات کو رواداری اور آپس کی ہمدردی سے قابلِ برداشت بنایا جاسکتا ہے۔ قومی ہمدردی کا جذبہ ہو تو بہت سے اختلافات کے ہوتے ہوئے اتفاق اور یک جہتی عمل میں آسکتی ہے۔

(ہ) مسلمانوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب کیا ہے؟

(جواب) قوم کے افراد جب قومی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر ذاتی فائدے اور ذاتی اغراض میں لگے رہیں، تو بالآخر وہ قوم زوال کا شکار ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کے زوال کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(و) سرسید کے مطابق قومی اتحاد کیسے قائم کیا جاسکتا ہے؟

(جواب) انسان کی ایک ذاتی زندگی ہوتی ہے اور دوسری زندگی وہ ہے جس میں اس کے معاملات دوسرے لوگوں سے وابستہ ہیں۔ سرسید کے مطابق ہمیں لوگوں کے اس دوسرے پہلو سے سروکار رکھنا چاہیے۔ ہمارا برتاؤ اپنی قوم کے ساتھ ہر طرح سے خیرخواہی کا ہونا چاہیے جسے سرسید نے قومی ہمدردی سے تعبیر کیا ہے۔ یہی قومی ہمدردی قومی اتفاق قائم کرسکتی ہے۔

(ز) قومی ہمدردی کے کیا فائدے ہیں؟

(جواب) قومی ہمدردی کے طفیل ہم نہ صرف خدا کے حکم کی اطاعت بجالاتے ہیں، بلکہ ہم ایک ایسے انسانی رشتے میں جڑ جاتے ہیں جس کی بنیاد ہمدردی پر مبنی ہے۔ یہ قومی ہمدردی ہے جو قوموں کو ترقی کی راہ پر ڈالتی ہے۔

(ح) شخصی اتفاق اور قومی اتفاق میں کیا فرق ہے؟

(جواب) ایک انسان سے مختلف طرح کے افعال کا صدور ہوتا ہے جس سے قدرتاً اختلاف بھی ہوتا ہے اور اتفاق بھی۔ انفرادی طور پر ہمیں جس کسی کے قول و عمل سے اتفاق ہو وہ شخصی اتفاق کہلاتا ہے۔ قومی اتفاق یہ ہے کہ ہمارے درمیان کیسے ہی چھوٹے بڑے اختلافات کیوں نہ ہوں، ہمارے قومی رویوں پر اس کا اثر ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ قومی سطح پر اتفاق اور اتحاد کی فضا قائم رہنی چاہیے۔

سوال نمبر2: اس سبق کا خلاصہ تحریر کیجیے:

(جواب) خلاصہ پچھلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر3: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) حبل المتین سے مراد ہے:

(الف) مذہب ✓ (ب) یک جہتی (ج) رنگ و نسل (د) قومیت

(۲) ہم سائے کا ادب ہمارے مذہب کا ہے:

(الف) جزو ✓ (ب) نصف (ج) کُل (د) مرکز

(۳) قومی ترقی کا بنیادی سبب ہوتا ہے:

(الف) مذہب (ب) تجارت (ج) زراعت (د) اتفاق ✓

(۴) سرسیّد کی نظر میں ہماری قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے:

(الف) مال و دولت نے (ب) نااتفاقی نے ✓ (ج) ذاتی مفادات نے (د) بے حسی نے

(۵) العروۃ الوثقیٰ سے مراد ہے:

(الف) اُخوّت (ب) اتحاد (ج) تنظیم (د) توحید ✓

سوال نمبر ۴: درج ذیل جملوں کی وضاحت کیجیے:

(الف) ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیاً ہو گیا ہے۔

وضاحت: موجودہ زمانے میں ہماری قوم کے زوال کا اصل سبب باہمی اتفاق و یگانگت کا ناپید ہو جانا ہے۔ ہماری قوم نے اتفاق و اتحاد کی اہمیت و برکت کو بالکل بھلا دیا ہے۔ قومی اتفاق کے بجائے ذاتی غرض، خود غرضی، بے حسی اور لالچ ہماری اجتماعی بربادی اور خسارے کا سبب بنتی جا رہی ہے۔ غضب بالائے غضب یہ ہے کہ کسی کو اس بے حسی اور زوال کا احساس بھی نہیں ہے۔

(ب) جس کسی نے العروۃ الوثقیٰ کلمۂ توحید کو مستحکم کیا وہ ایک قوم بن گیا۔

وضاحت: اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ یہ نسل پرستی اور قوم پرستی کی دعوت نہیں دیتا۔ اس کی دعوت کا مقصد خدا پرستی یا توحید پرستی ہے۔ رنگ و نسل کے تمام امتیازات پر ایک کلمہ توحید کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ وہ مضبوط رسی ہے جسے تھامنے والوں کو کسی دوسرے امتیاز پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔ کلمۂ توحید کو ماننے والے ایک قوم ہیں۔ دنیا کے تمام مسلمان اس کلمے کی نسبت سے ایک مضبوط روحانی رشتے سے منسلک ہیں۔ لہٰذا جو قوم کلمۂ توحید کو اپنا مرکز بنائے گی وہ ایک مضبوط قوم بن جائے گی۔

(ج) ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے مُبدّل کریں۔

وضاحت: آپس کی دشمنی، انتشار اور باہمی پھوٹ قوم کے زوال کے لیے شیطان کا ایک ہتھکنڈہ ہے۔ نااتفاقی کی بنا پر مسلمان رشتۂ اخوت کو توڑ کر مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناکامی، نامرادی، ذلت اور رسوائی ہمارا مقدر بن کے رہ گئی ہے۔ لیکن ابھی بھی ہمارے پاس وقت ہے کہ خود کو تباہی اور بربادی سے بچا سکتے ہیں۔ اور وہ واحد راستہ یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے سچی محبت، سچی دوستی، دوستانہ رویہ اور نیک برتاؤ رکھیں۔ نااتفاقی کی جگہ قومی اتفاق اور قومی ہمدردی کو اپنا نصب العین بنائیں۔

سوال نمبر ۵: ذیل کے الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ و تراکیب	جملے
یک جہتی	اتحاد و یک جہتی کے ساتھ ہم اپنے ملک کو ترقی دے سکتے ہیں۔
رشتۂ اخوت	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتۂ اخوت قائم کر دیا۔
اعانت	ضرورت مندوں کی اعانت کرنا ہمارا فرض ہے۔
منفعت	ذاتی منفعت سے بالا ہو کر ہمیں قومی منفعت کی فکر کرنی چاہیے۔
اَبنائے جنس	ہم پر اپنے رب کے ہی نہیں بلکہ ابنائے جنس کے حقوق کی ادائیگی بھی لازم ہے۔

سوال نمبر ۶: "قومی اتفاق کی ضرورت" کے عنوان پر ایک مضمون تحریر کیجیے:

قومی اتفاق کی ضرورت

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دورِ ماضی میں جو قومیں اپنی بداعمالیوں کی بدولت صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں ان قوموں کی تباہی کے اسباب میں سے ایک بہت بڑا سبب ان کے قبائلی اختلافات اور علاقائی تعصبات تھے۔ علاقائی تعصب وہ بد بلا ہے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ی ملک کے استحکام اور سالمیت کے لیے زہرِ قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔ علاقائی عصبیت کبھی نسلی بڑائی کے احساس سے جنم لیتی ہے، کبھی لسانی اور تہذیبی برتری کا احساس اس کی بنیاد بنتا ہے اور کبھی جغرافیائی حدود اس تنگ نظری کو جنم دیتی ہیں۔

عدم اتفاق کی بدولت دنیا میں دہائیوں تک فسادات کی آگ بھڑکتی رہی ہے جس کے شعلے آج بھی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر اختلافات کا شکار ہو کر ملی استحکام کھو بیٹھنا بہت خسارے کا سودا ہے۔ اسی عدم اتفاق نے ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہماری نادانیوں اور عدم برداشت نے پاکستان کے استحکام اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے بڑے بڑے فتنے اٹھائے ہیں۔ بالخصوص علاقائیت کی بنیاد پر روا رکھے جانے والے تعصب نے ہمارے ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ فی زمانہ بے راہروی، تفرقہ اور تعصب کی فضا اپنی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ نسلی، لسانی اور علاقائی تعصبات نے نسلِ انسانی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اس وقت انسانیت نااتفاقی کے سبب بڑی اذیت میں مبتلا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ بفضل اللہ مسلمان ایک عالمگیر و آفاقی مذہب کے علم بردار ہیں۔ اسلام ہی وہ مذہب ہے جو رنگ و نسل کے بدبودار نعروں سے دستبردار ہونے اور جغرافیائی وطنیت سے بالا ہو کر عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے اتحاد کی بنیاد صرف توحید کا عقیدہ ہے۔ وہ ملت جسے عقیدۂ توحید پر مستقیم رہنے کی تاکید کی گئی ہو، کو زیب نہیں دیتا کہ وہ علاقائی تعصبات کے بتوں کی پوجا کرنے لگے۔

موجودہ حالات میں ہمیں خلوصِ دل کے ساتھ اتحاد و اتفاق، مہر و مروت، اور رواداری و غمگساری کی فضا پیدا کرنا ہوگی۔ یہ ارضِ مقدس جو اس وقت باہم دشمنی، نفرت اور بغض و حسد کی آگ میں جل رہی ہے، جہالت اور تاریکی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے اس کو اپنے باطن میں تبدیلی لانا ہوگی۔ عزمِ نو کے ساتھ نظریۂ پاکستان اور ملی اخوت کی بنیاد پر اپنے ملک کی تعمیرِ نو کے لیے کام کرنا ہوگا۔ ہر طرح کے اختلافات کو دور یا محدود کر کے ملک کے استحکام کے لیے عملی اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ داخلی اور خارجی دشمن کی نظر نہ اٹھ سکے۔ اگر آج ہم نے قومی اتفاق کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اس پر سنجیدگی سے غور و فکر شروع کر دیا تو ہماری قومی زندگی کے مختلف دائروں میں تعمیر و ترقی کی بنیاد پڑ جائے گی۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

زبانِ گویا

مولانا الطاف حسین حالی

پیدائش ۱۸۳۷ء۔ وفات ۱۹۱۴ء

تعارف مصنف: مولانا الطاف حسین حالی پانی پت میں پیدا ہوئے۔آپ ایک شاعر، نقاد، سوانح نگار اور سرسید تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ابتدائی تعلیم حفظِ قرآن اور عربی فارسی سے شروع ہوئی۔۹ سال کی عمر میں والد کے انتقال کے بعد بہن بھائیوں نے تعلیم کا انتظام کیا۔۱۷ سال کی عمر میں دلی چلے گئے۔۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہنگامے کے بعد آپ نواب شیفتہ کے بچوں کے استاد مقرر ہوئے۔نواب شیفتہ نے غالب سے حالی کا تعارف کرایا۔غالب نے حالی کی شاعری دیکھی تو کہا کہ میں لوگوں کو شاعری کرنے سے باز رہنا کا کہتا ہوں، مگر تم شاعری نہیں کروگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔حالی، سرسید احمد خان کے ان ساتھیوں میں سے تھے جو اپنی قوم کو پستیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔سرسید کی فرمائش پر "مسدسِ حالی" یعنی مدوجزرِ اسلام تحریر کی۔حالی کی شاعری کا آغاز قدیم رنگ سے شروع ہوا مگر انھوں نے جدید شاعری کی طرح ڈالی۔حالی کو گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔وہ انگریزی نہیں جانتے تھے پھر بھی اُن کی بین الاقوامی ادب پر گہری نظر تھی کیوں کہ وہ ترجموں کی زبان کو خالص ادبی زبان میں لکھتے تھے۔حالی کا اسلوب نہایت سادہ، سلیس، صاف، رواں اور عام فہم ہے۔جہاں وہ سادگی اور سلاست کو شاعری کے لیے ضروری سمجھتے ہیں وہیں اسے نثر نگاری کے لیے بھی لازمی سمجھتے ہیں۔مولانا حالی نے اپنی نثر نگاری کو مقصدیت کے تابع کیا۔حالی کی سب سے بڑی خوبی ان کا مدلل اندازِ بیان ہے۔حالی نے اُردو میں سوانح نگاری کا باقاعدہ آغاز کیا۔اس کے علاوہ انھیں اردو کا پہلا نقاد بھی کہا جاتا ہے۔انھوں نے انجمن پنجاب کی تحریک کے زیرِ اثر نظم کے فروغ میں بھی بنیادی کردار ادا کیا۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
زبانِ گویا	کہنے/بولنے والی زبان	طوطی شیوا بیان	فصیح گفتگو کرنے والی زبان مراد ہے
بُلبلِ ہزار داستان	خوش بیان یعنی زبان	قاصد	پیغام پہنچانے والا
ساحر	جادو کرنے والا	فُسوں ساز	جادوگر
افعی	نہایت زہریلا سانپ	جاں گداز	جان گھلانے والا۔ دل پر اثر کرنے والا
دارو	دوا	منتر	جادو
فگار	زخمی	بِس کی گانٹھیں	زہر کی گٹھلیاں
بول	قول۔ سخن	حنظل	ایک نہایت بدذائقہ پھل

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

تریاق	زہر کی دوا۔زہر کا توڑ	پارۂ گشت	گوشت کا ٹکڑا
رائیگاں	بے کار	راستی	سچائی
جوہر	ہنر، کمال، لیاقت	امین	امانت دار
ایلچی	قاصد	منصب	مرتبہ
عالی	بلند	کاشفِ اسرار	بھید کھولنے والا
محرم راز	ہم راز	خزانۂ غیبی	چھپا ہوا خزانہ
قفل	تالا	کنجی	چابی
تلقین وارشاد	تعلیم وتربیت	ناصح مشفق	مہربان نصیحت کرنے والا
صفت	خوبی	غیبت	پیٹھ پیچھے برائی
تہمت	عیب/الزام	زبوں	خراب
زیاں	نقصان	شہد فائق	اچھا شہد۔خالص شہد
راست گفتار	سچ کہنے والا	فریبی	دھوکا دینے والا
مکار	دھوکے باز	سخن ساز	باتیں بنانے والا
ریاکار	دکھاوا کرنے والا	بدعہد	وعدہ خلاف
غمّاز	چغل خور	مکر وافترا	دھوکا اور الزام تراشی
طعن	طنز	تشنیع	برا بھلا کہنا
دُشنام	بدکلامی	پھکڑ	گالی گلوچ
ضلع جگت	ذومعنی بات/لطیفہ	پھبتی	طنزیہ فقرہ جو کسی پر چست کیا جائے
سزاوار	لائق	مطلق العنان	بے لگام
رخصت گفتار	گفتگو کی اجازت		

مرکزی خیال: انسان اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جسے زبان دی گئی ہے کہ اظہارِ حال کر سکے۔ دیکھنے میں بظاہر یہ ایک گوشت کا ٹکڑا ہے، لیکن اپنے اندر ایک طاقت اور قوت رکھتی ہے۔ اب یہ انسانوں پر منحصر ہے کہ وہ اس زبان کے آلے سے لوگوں میں علم اور خیر کی باتیں منتقل کرتا ہے، یا زبان کے خنجر سے دلوں کو دکھاتا ہے۔ انسانوں کو چاہیے کہ زبان کی آفتوں سے اللہ کی پناہ مانگیں اور کسی طرح اس کو بے لگام مت ہونے دیں۔ کیوں کہ یہ زبان ہی ہے جس کا درست استعمال دنیا میں نیک نامی دلاتا ہے، اور ناروا استعمال کردار پر دھبہ لگواتا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

حوالہ سبق: یہ اقتباس شامل نصاب مضمون "زبانِ گویا" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔

اہم اقتباسات کی تشریح

(۱) "تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی ہے۔ تو وہی زبان ہے جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔"

تشریح: انسان کی زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ ایک بچپن کا زمانہ ہوتا ہے جس میں بچے کے پاس الفاظ کی محدود دنیا اور بہت کم معلومات ہوتی ہیں۔ بچپن کی معصومیت سے گندھے الفاظ جب اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو دیکھنے والوں کو اس کی اس سادگی اور معصومیت پر پیار آجاتا ہے۔ بچے کی زبان سے ادا ہونے والے ادھورے فقرے دل کی سچی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ جس میں کسی طرح کا تکلف اور تصنع نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک طرح کی بے ساختگی ہوتی ہے۔ کبھی وہ بے ساختگی ایسی شوخ صورت اختیار کر جاتی ہے جو ناگوار بھی گزرتی ہے۔ عقل اور سمجھ کا سرمایہ محدود ہونے کے سبب بچے سے ناپسندیدہ اور غیر شائستہ باتیں صادر ہو کر ماں باپ کے دلوں کو زخمی کر دیتی ہیں۔ جب کہ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ماں باپ کی اپنی اولاد سے محبت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جب جوانی کی دہلیز پر انسان قدم رکھتا ہے تو بالعموم جذبات میں توازن بہت کم ہوا کرتا ہے۔ زندگی کی بعض رغبتیں اس کے کسی کسی جذبے کو زیادہ ابھار کر وہ کام لیتی ہیں کہ جوانی دیوانی کا مقولہ صادق آتا ہے۔ وہ اپنی جوانی میں ایسا مدہوش ہوتا ہے کہ اپنی زبان کو اپنے جذبات کی تسکین کا وسیلہ گردانتا ہے۔ اس کی زبان سے مہربانی کے کلمات نچھاور ہوتے ہیں تو دوسرے کو دام میں لانے کے لیے ہوتے ہیں۔ اور یہی زبان انسانی جذبات کے ہاتھوں اس قدر مغلوب ہو جاتی ہے کہ وہ الفاظ سے نشتر کا کام لیتی ہے اور لوگوں کے دلوں کو چیر کے رکھ دیتی ہے۔

(۲) "دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنی کھیل ہے، جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔ اے میری بنی بات کو بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا ہے اور کس سے سیکھا؟"

تشریح: روزمرہ بات چیت میں زبان ایک اہم وسیلہ ہے جس سے انسانی خیالات کی ترسیل ہوتی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ تاریخ نے وہ مناظر بھی دیکھے ہیں کہ جب زبان کے بے جا استعمال نے بہت سے لوگوں کا دل دکھایا ہے۔ اچھے بھلے ہم راز دوست بھی جان کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب ہمارے جذبات کا طوفان ابل رہا ہوتا ہے اور اس کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں رہتا۔ ضبط اور حوصلہ کی کمی زبان میں کڑواہٹ گھول کر اس سے وہ سب کہلواتی ہے جسے کوئی سننا اور برداشت کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور یہی زبان ہے جو ہمارے احساسات کی ترجمان بھی ہے۔ اس زبان سے ادا ہونے والے نرم اور سبک الفاظ سنگ دلوں کو موم کر دیتے ہیں۔ بقول بابر عطا:

پتھروں کو موم کرنا تو کوئی مشکل نہیں　　　　شرط یہ ہے بات میں تاثیر ہونی چاہیے

یہ حقیقت ہے انسانوں کے باہم تعلقات ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے۔ ان میں اتار چڑھاؤ اور غیر معمولی انقلاب آتا رہتا ہے۔ ان

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سب معاملات میں زبان کا کلیدی کردار ہے۔ مولانا حالی زبان کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں اے زبان! تو بظاہر جسم کا ایک حصہ ہے، مگر کیا بات ہے بگڑے ہوئے معاملات سنورتے ہیں تو تیرے ہی فیض سے۔ بنی بنائی بات بگڑتی ہے تو وہ بھی تیرے ہی طفیل۔ اے زبان! تجھ سے ادا ہونے والے خوشنما الفاظ اداس، افسردہ اور غمزدہ لوگوں کے دلوں میں بہار لے آتے ہیں؛ کوئی مسرور اور مطمئن ہو تو تیرے الفاظ اس کے کلیجے پہ آرے چلا دیتے ہیں۔ یہ بیک وقت لطف و کرم اور ظلم و ستم کی ادائیں تو نے کہاں سے سیکھی ہیں!

(۳) "اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں، مگر تیری طاقت نمونہ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ اس وقت کو رائگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔"

تشریح: بلاشبہ زبان ایک گوشت کا ٹکڑا ہی تو ہے مگر قدرت نے اسے وہ صلاحیت عطا کی ہے کہ دلوں کی کیفیات کو بیان کر سکے۔ اس کی طاقت اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ جس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ کبھی اپنے میٹھے بول سے دوسروں کے جی موہ لیتی ہے، تو کبھی امن و سکون کے ماحول کو جنگ و جدل میں بدل دیتی ہے۔ ہنستے بستے لوگ آگ اور شعلوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ خون کی بو ہر سو پھیل جاتی ہے۔ مولانا حالی زبان کی اس غیر معمولی طاقت کو بیان کر کے اسے مشورہ دے رہے ہیں کہ طاقت کے بے جا استعمال سے انحراف مت کر۔ زبان پر ٹوک اور منہ پہ لگام لگا دینی چاہیے اگر یہ لایعنی اور فضول گوئی میں مشغول رہ کر وقت برباد کرے۔ زبان کو تخلیق اسی لیے کیا گیا ہے کہ سچ کو اپنا شعار بنائے۔ جب تک جان میں جان ہے اس سے ہدایت، نیکی اور صحیح سمت کی جانب رہنمائی کا کام لینا چاہیے، خواہ کیسی ہی مصیبت کیوں نہ جھیلنی پڑے۔ زبان کا مناسب آزادی کے ساتھ استعمال اس کی اہمیت دو چند کر دیتا ہے۔

(۴) "اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے کہیں تیرا لقب محرمِ راز۔ علم ایک خزانہ غیبی اور دل اس کا خزانچی، حوصلہ اُس کا قُفل ہے اور تُو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قُفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اُٹھا۔"

تشریح: مولانا حالی زبان کو مخاطب کر کے دراصل انسان کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ زبان انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ہمارے خیالات اور مافی الضمیر کا اظہار اسی کے ذریعے ہوتا ہے۔ سر کے بال سے لے کر پاؤں کے ناخن تک کی ساری کیفیات کا اظہار زبان کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے زبان کا منصب بہت بلند بھی ہے، لیکن اپنے اندر ایک احساسِ ذمہ داری بھی لیے ہوئے ہے۔ کیسے چھپے ہوئے علم کے خزانے اور پوشیدہ حقیقتوں کے راز ہیں جو زبان سے عیاں ہوتے ہیں۔ کتنے ایسے راز ہیں کہ زبان چاہے تو بیان کر کے نظامِ زندگی میں بھونچال لا سکتی ہے، مگر وہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ حضرت انسان کو قدرت کی طرف سے عظیم الشان علم کا خزانہ ودیعت ہوا جس کا مرکز انسانی قلب کو بنایا گیا ہے۔ علم ایک عظیم دولت ہے۔ بذاتِ خود یہ کوئی مفید چیز نہیں جب تک کہ اس کا استعمال نہ ہو۔ اس کا استعمال اور اظہار کچھ چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ کتنا اور کیسے علم منتقل کرنا ہے اس کے لیے موقع محل کی اہمیت ہے۔ مناسب ضبط اور حوصلہ کا مظاہرہ اصل امتحان ہے۔ مناسب سوجھ بوجھ کے بغیر اس خزانے کو خرچ کیا جائے تو اکثر مفید نتائج نہیں مل پاتے۔ اس لیے لازم ہے کہ زبان اور حوصلہ کو بوقت ضرورت کام میں لایا جائے۔ تا کہ نقصانات سے بچا جا سکے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) اس مضمون کے آغاز میں زبان کے لیے کون کون سے الفاظ و تراکیب استعمال ہوئے ہیں؟

(جواب) مضمون کی ابتدا میں مصنف نے زبان کے لیے بلبلِ ہزار داستان، طوطیِ شیوا بیان، قاصد، ترجمان اور وکیل کے الفاظ و تراکیب استعمال کیے ہیں۔

(ب) بچپن میں زبان کا کیا کردار بیان کیا گیا ہے؟

(جواب) بچہ جب اپنی کچی عمر میں بولنا شروع کرتا ہے تو اس کے منہ سے ادا ہونے والے ٹوٹے پھوٹے الفاظ لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ چوں کہ یہ ناسمجھی کا زمانہ ہوتا ہے، تو بعض اوقات ان کے لبوں سے خلافِ تہذیب الفاظ والدین کے دلوں کو زخمی بھی کر دیتے ہیں۔

(ج) کن باتوں سے زبان کی خصوصیات کو نقصان پہنچتا ہے؟

(جواب) جھوٹ، غیبت، تہمت، فریب، چغل خوری جیسی برائیوں سے زبان آلودہ ہو جائے تو اس کی خصوصیات کو نقصان پہنچتا ہے۔

(د) حالی نے زبان کی طاقت کو نمونۂ قدرتِ الٰہی کیوں کہا ہے؟

(جواب) زبان کو اللہ پاک کی طرف سے بے پناہ طاقت دی گئی ہے۔ بظاہر گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا ہے مگر اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ زبان کے زور پر لوگوں کے دلوں پر حکومت کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ بے قابو ہو جائے تو قیامت بھی برپا کر سکتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب یہ اپنی حدود و قیود کی پابند نہ رہ سکے اور اپنے بنیادی فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی برتے۔

(ہ) زبان کو منصب اور خدمت کے لحاظ سے کن صفات کا حامل قرار دیا گیا ہے؟

(جواب) انسانی جسم میں زبان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ زبان ہے جو رمز کی باتوں کو آشکار کرتی ہے۔ راز کی حفاظت کرتی ہے اور اسے بیان بھی کرتی ہے۔ لوگوں کو اچھی باتیں اور ہدایت کی روشنی پہنچانے میں زبان کا اہم کردار ہے۔ اتنے اہم منصب پر فائز ہو کر اس کے لیے لازم ہے کہ ضبط کا مظاہرہ کرے۔ موقع محل کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنی خدمات پیش کرنی چاہییں۔

(و) زبان کے بہتر استعمال کے حوالے سے مصنف نے کیا دعا کی ہے؟

(جواب) مصنف نے بارگاہِ عالی میں دعا کی ہے کہ جو زبان ملی ہے تو اسے کلمۂ خیر ادا کرنے والی، صحیح بات کی طرف رہنمائی کرنے والی بنا؛ اور ہمیں وہ طاقت و ہمت عطا فرما کہ زبان کا صحیح استعمال کر سکیں۔

سوال نمبر ۲: اس سبق کا مرکزی خیال تحریر کیجیے:

(جواب) مرکزی خیال پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۳: درج ذیل اقتباسات کی تشریح بہ حوالۂ متن کیجیے:

(الف) ”دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنیٰ کھیل ہے جس کے تماشے سیکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں“۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(ب) ''علم ایک خزانہ غیبی اور دل اُس کا خزانچی، حوصلہ اس کا قفل ہے اور تُو اس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا''۔

(ج) ''اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونہ قدرت الٰہی ہے''۔

(جواب) مذکورہ بالا اقتباسات کی تشریح اوپر ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۴: درج ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ وتراکیب	جملے
محرم راز	جب محرم راز مل جائے تو اسے دل کا حال سنایا جاتا ہے۔
سخن ساز	مفاد پرست لوگ بلا کے سخن ساز ہوتے ہیں۔
مطلق العنان	تاریخ میں ایسے مطلق العنان حکمرانوں کا ذکر ملتا ہے جن کے دبدبے کی مثالیں دی جاتی ہیں۔
راست گفتار	ہمارے معاشرے میں راست گفتاری عام ہو جائے تو بہت سی برائیوں کا خاتمہ ممکن ہے۔
جوہر	شاعری کا جوہر ہو تو اس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔
تریاق	ستم رسیدہ لوگوں پر تسلی کے الفاظ تریاق کا کام دیتے ہیں۔
حنظل	مشکل تو یہ ہے کہ شہد بنو تو لوگ چٹ کر جائیں، حنظل بنو تو دور ہو جائیں۔
منصبِ عالی	جس منصبِ عالی پر وہ براجمان تھے، عامیانہ حرکت انھیں ہرگز زیب نہ دیتی تھی۔

سوال نمبر ۵: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) زبان کے ہر پھول کا رنگ ہے:

(الف) نرالا (ب) جدا ✓ (ج) علیحدہ (د) مختلف

(۲) اے زبان تیری طاقت نمونہ ہے:

(الف) اللہ کی طاقت کا (ب) قدرت الٰہی کا ✓ (ج) اللہ کی رحمت کا (د) قدرت آسمانی کا

(۳) علم ایک خزانہ ہے:

(الف) غیبی ✓ (ب) پوشیدہ (ج) چھپا ہوا (د) دبا ہوا

(۴) زبان کا جوہر ہے:

(الف) نصیحت (ب) راستی ✓ (ج) وعظ (د) گفتگو

(۵) ہم جب تک دنیا میں رہیں کہلائیں:

(الف) اچھے (ب) سچے ✓ (ج) نیک (د) سیدھے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

فاقے کا روزہ ☆

خواجہ حسن نظامی

پیدائش ۱۸۶۳ء۔ وفات ۱۹۵۵ء

تعارف مصنف: خواجہ حسن نظامی کا نام علی حسن تھا مگر حسن نظامی کے نام سے مشہور ہوئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے خاندان سے تعلق تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے وابستہ رہے۔ خواجہ حسن نظامی ایک بے مثال اور باکمال ادیب ہیں جنھوں نے مختلف اصناف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ فارسی اور عربی تعلیم کے حصول کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے، مگر شُدبُد کے سوا اس میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کر سکے۔ آپ کو ادب اور لکھنے لکھانے کا شوق اس طرح پیدا ہوا کہ ایک بار اخبار آپ کی نظروں سے گزرا تو اس کے تمام مضامین پڑھ کر خوش ہوئے اور خود بھی لکھنا شروع کر دیا اور یہ شوق اس حد تک بڑھا کہ بارہ سال کے عرصے میں چالیس سے زائد کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ شروع ہی سے صوفیانہ ماحول نے آپ کو بھی صوفی بنا دیا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کی پہلی تصنیف "مفلسی کا مجرب علاج" تھی۔ آپ کی نثر سادگی اور پُرکاری سے مزین ہے۔ خیال سے خیال اور بات سے بات پیدا کرنے اور روانی اور سلاست آپ کی تحریر کا خاصا ہے۔ یہ رنگ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے واقعات بیان کرنے میں نمایاں ہے۔ خواجہ صاحب نے انتہائی معمولی معمولی عنوانات پر قلم اٹھا کر انھیں خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو مصورِ فطرت کہا جاتا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں مفلسی کا مجرب علاج، سفرنامہ مصر و شام و حجاز، قرام قبلہ ٹو شملہ، خدائی انکم ٹیکس، بیگمات کے آنسو، غدرِ دہلی کے افسانے اور سی پارۂ دل شامل ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
فاقہ	بے کھائے پیے ہونا۔ بھوکا ہونا	لونڈی	خادمہ
تیموریوں	امیر تیمور کی اولاد۔ مغل بادشاہ مراد ہیں	مغموم	غم زدہ
ندیم	دوست/ساتھی	خیر باشد	خیر تو ہے؟
مُکدر	غم گین	مُصاحب	ساتھ رہنے والا
جمگھٹے	ہجوم۔ بھیڑ بھاڑ	صلاح	مشورہ۔ تجویز
مُراقبہ	خُدا کا دھیان	کُلُّ جَدِید لَذِیذ	ہر نئی چیز مزے دار ہوتی ہے
مُتکلف	پُرتکلف	خوان پوش	تھال ڈھکنے کا کپڑا

☆ نوٹ: اس مضمون کا عنوان دراصل "فاقہ میں روزہ" ہے۔ جو بیگمات کے آنسو میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ نظام المشائخ ستمبر 1910ء میں بھی یہ مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

مقیشی	سونے چاندی کے تاروں کی بنی ہوئی	آرائش	سجاوٹ
تاراج	برباد	غدر	بغاوت، مراد ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی
کرچ	ایک قسم کی لمبی تلوار	سنگین	ایک نوک دار ہتھیار جو بندوق پر چڑھایا جاتا ہے
چکمانہ توڑ جوڑ	دھوکا دہی اور سازش	آتش ناک	آگ سے بھری
حضور ظلِ سبحانی	بادشاہ	جولاں گاہ	گھڑ دوڑ کا میدان
لق ودق	ویران	زار ونزار	ناتواں
دِلاسہ	تسلّی	جواہر نگار	قیمتی پتھروں سے آراستہ
سرکشی	بغاوت	بھادوں	ہندی چاند کا چھٹا مہینہ (تقریباً نصف اگست سے نصف ستمبر تک)
لہوولعب	کھیل کود	لوٹ پیٹ کر اچھے ہونا	بیمار ہو کر بغیر دوا کھائے اچھا ہو جانا
غرقاب	پانی کے اندر	چھپر	پھونس کا سائبان
بلّیوں	بلی کی جمع۔ لکڑی کے ستون	کھیل	وہ بھنا ہوا اناج جو پھول گیا ہو (مثلاً چاول کے مرمرے)
متغیر	بدلا ہوا	شیوہ	طریقہ

مرکزی خیال: یہ کہانی دراصل مرنے والی تہذیب اور تاریخ کا ایک نوحہ ہے۔ مسرت ہو یا آزمائش؛ دوام کسی کو نہیں۔ مصائب و آلام سے بھرپور یہ افسانہ رحم و عبرت کے جذبات انسانوں کے دل میں پیدا کرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کردار مرزا اسلیم بہادر نے اپنی آنکھوں سے ایک گرجتے ہوئے انقلاب کی تباہ کاریاں دیکھی تھیں۔ ایک معاشرے کو دم توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے سامنے ایک سلطنت کا جھلملاتا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھا تھا اور ایک نئے دور نے جنم لیا تھا۔ شہر کی بربادی اور حکومت کے زوال سے جنم لینے والا المیہ انسانی نفسیات پر گہرا نقش چھوڑنے کے ساتھ وہ زخم دے جاتا ہے جسے چاہیں بھی تو بھرا نہیں جا سکتا۔

خلاصہ: یہ اس زمانے کی بات ہے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر ہندوستان کے حکمران تھے۔ دارالحکومت دہلی میں مرزا اسلیم بہادر دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے کہ انکی والدہ نے انھیں بلا کے تاکید کر دی کہ رمضان میں راگ رنگ کی محفلیں موقوف کر دی جائیں۔ یہ حکم ان کی طبیعت پر ناگوار گزرا، مگر مصاحبین میں سے ایک شخص نے انھیں ترغیب دی کہ رمضان المبارک میں مسجد جا کر وہاں روح پرور ماحول کا نظارہ کر کے دیکھیں۔ مرزا نے مسجد میں ذکر کی محفلیں، دینی مجلسیں، قرآن خوانی اور افطار کے وقت کی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

رونق دیکھی تو ان کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ اب ان کا جھکاؤ مسجد کی طرف بھی ہو چلا تھا۔ یوں شب و روز گزر رہے تھے کہ ۱۸۵۷ کا ہنگامہ آ پہنچا۔ شاہی خاندان کو اپنی جانیں بچانا مشکل ہو گیا۔ انگریزوں نے دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ پورے شہر میں بدامنی کی فضا تھی۔ اپنے خاندان کو کسی طرح محل سے نکال کر بچتے بچاتے وہ چھتر پور پہنچے۔ یہاں ڈاکوؤں نے ان کا اسباب لوٹ لیا۔ ایک بے بسی کا عالم تھا۔ اپنی بوڑھی والدہ، بیمار بیوی اور کمسن بیٹی کے ساتھ وہ جنگل میں کھڑے تھے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس خاندان پر ٹوٹنے والی آزمائش کے پہاڑ نے انھیں اس حال پہ پہنچا دیا تھا۔ اس سے پہلے کئی صدیاں مغلیہ خاندان کا طنطنہ اور شان و شوکت دیکھ چکی تھیں۔ خیر محفوظ رہنے کا ٹھکانہ ملا مگر تقدیر کی ستم ظریفی نے پیچھا نہ چھوڑا۔ گاؤں میں رہتے ہوئے کبھی وبائی بخار نے آ گھیرا اور یوں لگا جیسے جان لے کر ٹلے گا۔ کبھی طوفان کے سبب جان کے لالے پڑ گئے۔ جو اناج غلہ تھا کسی کام کا نہ رہا۔ گاؤں کے چودھری نے آٹے کا بندوبست کر کے دیا تو ماضی کا سنہرا دور یاد کرتے ہوئے کچھ دن گزار لیے۔ ماہِ رمضان شروع ہوا مگر سحر و افطار کے واسطے کچھ نہ تھا۔ اس مجبور گھرانے نے فاقوں کی حالت میں روزے رکھ کر دو دن گزارے۔ بے کسی کے عالم میں ماں نے آہ و زاری کے ساتھ دعا کی۔ افطار کے وقت گاؤں کے چودھری نے نیاز کا کھانا اور زکوٰۃ کی رقم بھجوائی تو والدہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ شاہی خاندان کی نسبت سے زکوٰۃ لینا انھیں گوارا نہ تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر اسے قبول کر لیا۔ یوں جسم و جان کا رشتہ قائم رکھ کر اس شاہی گھرانے نے گاؤں میں کچھ وقت گزار کر شہر دہلی کی راہ لی اور قدرے عافیت کے دن گزارے۔

مشق

سوال نمبر ا: **درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:**

(الف) **نتھن خان کے گانے سے اُکتا کر اماں حضرت نے کیا حکم صادر فرمایا؟**

(جواب) نتھن خان کے گانے سے اُکتا کر اماں حضرت نے حکم دیا کہ رمضان المبارک کے احترام میں گانے بجانے کی محفلیں موقوف کی جائیں۔

(ب) **مصاحب نے مرزا صاحب کو کیا مشورہ دیا؟**

(جواب) مصاحب نے مرزا صاحب کو مشورہ دیا کہ افطاری سے قبل وہ جامع مسجد میں تشریف لے جایا کریں۔ وہاں کی رونق اور روحانی ماحول طبیعت پر خوش گوار اثر ڈالے گا۔

(ج) **"کُلُّ جدیدٍ لذیذ" سے کیا مراد ہے؟**

(جواب) کل جدید لذیذ عربی ضرب المثل ہے جس کا مطلب ہے کہ ہر نئی چیز میں لطف ہوتا ہے۔

(د) **رمضان میں افطاری کے وقت مسجد میں کیا سماں تھا؟**

(جواب) رمضان میں افطاری کے وقت جگہ جگہ تعلیم و تعلّم کے حلقے تھے۔ قرآن شریف سنا اور سنایا جا رہا تھا۔ دینی مسائل پر مذاکرہ ہو رہا تھا۔ کہیں مراقبہ کا حلقہ قائم تھا۔ کہیں وظائف اور ذکر و اذکار کا سلسلہ تھا۔ افطاری میں بھی اہتمام نظر آتا تھا۔ مسجد میں

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

روزہ داروں کے لیے افطاری لائی جا رہی تھی۔ اتنی کثرت سے افطاری کے سامان آ رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لوگ اس نیکی کے کام میں سبقت لے جانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

(ہ) **مرزا صاحب کو کیا بات اچھی لگی کہ وہ با قاعدہ مسجد آنے لگے؟**

(جواب) مرزا صاحب کو رمضان میں مسجد کی رونق اچھی لگی۔ رمضان کا اہتمام جس طرح عبادات، ذکر و اذکار اور روزہ داروں کو کھلانے کی صورت میں ہوتا تھا، مرزا صاحب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ با قاعدہ مسجد آنے لگے۔

(و) **غدر کی تباہی کے شاہی خاندان پر اثرات بیان کیجیے:**

(جواب) غدر کی تباہی نے بہت سے اندوہناک المیوں کو جنم دیا۔ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی بیگمات اور شہزادوں پر جو مصائب نازل ہوئے ان کی داستان ایسی دل گداز اور اثر انگیز ہے کہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اونچے محلات میں رہنے والے در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ غدر کے باعث شاہی جاہ و جلال خاک میں مل گیا۔ جنھوں نے اپنی آنکھ سے سلطنت کا چراغ بجھتے اور دلی کو برباد ہوتے دیکھا تھا، اس کا زخم ان کے سینے میں ہمیشہ ہرا رہا۔

سوال نمبر ۲: **درج ذیل الفاظ و محاورات کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:**

الفاظ و تراکیب	جملے
زنان خانہ	جواں مرگ شہزادے کی خبر سن کر زنان خانے سے آہ و بکا کی صدا آنے لگی۔
مغموم	مغموم شخص کے لیے دوسروں کی خوشی بے معنی ہوتی ہے۔
عجب بہار ہونا	تہوار کے موقع پر عجب بہار تھی۔ سوغاتیں بٹ رہی تھیں، بچے جھول رہے تھے، ہر چہرہ جگمگا رہا تھا۔
مکلف	اس سے زیادہ کے ہم مکلف نہیں کہ جتنے فرائض ہمیں سونپے گئے ہیں انھیں خوش اسلوبی سے انجام دیں۔
زیر وزبر ہونا	کیا خبر تھی کہ اس ایک شخص کے جانے سے دنیا زیر و زبر ہو جائے گی۔
ماما گیری	جن بیگمات کے اشارۂ ابرو کے لوگ منتظر رہتے تھے، گردشِ زمانہ نے انھیں ماما گیری پہ مجبور کر دیا۔
دلاسا دینا	دکھیاری کا غم ایسا شدید تھا کہ لوگوں نے جتنے دلاسے دیے، سب بے اثر رہے۔
مکدّر	پڑھے لکھے لوگوں کو باہم لڑتے دیکھ کر طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔

سوال نمبر ۳: **درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:**

(۱) ہندوستان کا دل کہلاتی تھی:

(الف) بادشاہی (ب) دلی ✓ (ج) مسجد (د) رنگینی

(۲) ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے:

(الف) ندیم (ب) مرزا صاحب (ج) مرزا سلیم بہادر ✓ (د) مرزا شہ زور

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۳) "لہو ولعب" کا مطلب ہے:

(الف) کھیل کود ✓ (ب) فضول خرچ (ج) مزے دار کھانے (د) شان وشوکت

(۴) رنگ متغیر ہونا ہے:

(الف) روزمرہ (ب) محاورہ ✓ (ج) ضرب المثل (د) کہاوت

(۵) انگریزی سرکار نے ماہ وار پنشن مقرر کر دی:

(الف) چار روپے (ب) پانچ روپے ✓ (ج) دس روپے (د) پندرہ روپے

سوال نمبر ۴: درج ذیل اقتباسات کی وضاحت کیجیے:

(الف) "تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاجوروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کر دیا جو بے کسوں کے کام آتے تھے۔"

تشریح: مرزا سلیم بہادر کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ جنگِ آزادی کے نتیجے میں ان کے خاندان کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ ساز وسامان تھا نہ رہنے کو مکان۔ جنگل میں بے آسرا پڑے تھے کہ اس بے چارگی کے عالم میں ان کی والدہ کی زبان سے درد و کرب میں ڈوبے الفاظ نکلتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ ایک وہ وقت تھا کہ ہماری حکومت تھی۔ عزت، مقام اور شہرت تھی۔ ہمارے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ شاہوں سے مرعوب ہونے کے بجائے ان پر غلبہ پا لیتے تھے۔ مگر اب بقول حالی: ''پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے''۔ گردشِ تقدیر نے وہ دن دکھائے ہیں کہ نہ حکومت رہی، نہ جاہ وجلال۔ ہمارے ہاتھوں سے غریبوں، مسکینوں، بے کسوں کو امداد ہوا کرتی تھی۔ مگر اب حقیقت ایسی دردناک ہے کہ ہماری اپنی حالت بے بسی کی تصویر پیش کر رہی ہے۔ ہمارے وجود کی بقا لوگوں کے رحم و کرم پر ہے۔

(ب) "اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مرجانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے، صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں۔"

تشریح: شاہی خاندان کے فرد مرزا سلیم بہادر کے گھرانے کو جنگِ آزادی کے بعد رہنے کو ٹھکانہ تو مل گیا، لیکن غربت کا یہ حال تھا کہ وہ کئی کئی وقت فاقوں میں رہ کر گزار دیتے تھے۔ رمضان کے دو روزے بھی ایسے نصیب ہوئے کہ نہ سحر میں کھانے کو کچھ تھا، نہ افطار کو۔ آخر گاؤں کے چودھری نے زکوٰۃ کی رقم بھجوائی جو ضرورت کے لیے کافی تھی، مگر مرزا سلیم کی والدہ کی خاندانی غیرت اچانک جوش میں آ گئی۔ انھوں نے غیظ وغضب کے عالم میں کہا کہ ہماری شان وشوکت اگرچہ مٹ گئی ہے، لیکن خاندانی حمیت ابھی باقی ہے۔ لوگوں کی امداد کی امید پر زندگی بسر کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ہم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاہوں کا انداز کسی کا دست نگر بن کے رہنے کے بجائے میدان میں مقابلہ کرنے کو پسند کرتا آیا ہے۔ وہ فاتح بن کر اپنے رزق کی وسعت کا سامان کرتے ہیں یا میدانِ جنگ میں کام آ جاتے ہیں۔ صدقہ پر گزر بسر غیرت وحمیت کا سودا کرنے کے مترادف ہے۔

سوال نمبر ۵: سبق کے کوئی پانچ محاورے اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

محاورات	جملے
کلیجہ پھٹنا	معصوم بچے کو بے یارومددگار دیکھ کر حساس لوگوں کا کلیجہ پھٹتا تھا۔
گولیوں کا مینہ برسنا	قابض فوج دن بھر معصوم لوگوں پر گولیوں کا مینہ برساتی رہی
ٹھوکریں کھانا	کامیابی ٹھوکر کھا کے سنبھلنے والوں کے قدم چومتی ہے۔
ہوائیاں اڑنا	تپتی دوپہر میں لُٹ پِٹ کر جب وہ گھر پہنچے تو ان کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔
کلیجہ منہ کو آنا	سانحہ ایسا شدید تھا کہ سوچتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

تخلیقِ کائنات*

آفتاب حسن

پیدائش ۱۹۰۹ء۔ وفات ۱۹۹۳ء

مصنف کا تعارف: "تخلیقِ کائنات" کے مصنف میجر آفتاب حسن کا اصل موضوع سائنس ہے۔ لیکن چوں کہ ادب سے بھی انھیں ذوق رہا ہے، اس لیے سائنسی موضوعات کو دلچسپ، آسان اور رواں زبان میں بیان کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں۔ بیسویں صدی کو سائنس اور ایجادات کی صدی کا نام دیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں سائنسی اصطلاحات سازی اور سائنسی موضوعات پر کتب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ وہ کئی سائنسی رسالوں کے مدیر بھی رہے۔ انھوں نے اردو زبان میں سائنسی مضامین کے تراجم بھی کیے۔ ان کی اہم تصانیف میں "اردو ذریعہ تعلیم اور اصطلاحات"، "معلومات سائنس"، "جدید معلومات سائنس"، "سائنس کی باتیں"، "سائنس سب کے لیے"، "سائنس ہمارے لیے"، "آئن اسٹائن اور کائنات" وغیرہ ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اَن مول	بے حد قیمتی	حمل و نقل	بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا
سردست	ابھی	جزیرہ زانٹے	یونان کا ایک جزیرہ
صقلیہ	اٹلی کا ایک جزیرہ جسے اطالوی میں سسلیہ اور عربی میں صقلیہ کہتے ہیں	قیر	ایک کالا گوند
مُزیّن	سجائے ہوئے	رُسُوبی	تہ سے نسبت رکھنے والی شے
چٹانیں	چٹان کی جمع۔ بڑا اور چوڑا پتھر	مدوجزر	اُتار چڑھاؤ
ہَل چَل	بے قراری	مسام	مسم کی جمع۔ بہت باریک/مہین سوراخ
آتش فشانی	آگ جھاڑنا	سنگ خارا	نیلے رنگ کا سخت پتھر
ارضیات	زمین کے طبقوں کا علم (جیولوجی)		

خلاصہ: اس مضمون میں میجر آفتاب حسن بتاتے ہیں کہ زمین کی گہرائیوں سے نکلنے والی دولت میں سے پٹرول کا بدل نہیں ہوتا۔ یہ ایسی توانائی کا سرچشمہ ہے جس سے متحرک مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ بجلی سے کارخانے اور دوسری ساکن مشینیں چل سکتی ہیں۔ کوئلہ بہت بھاری ہوتا ہے اور اس سے توانائی بھی نسبتاً کم حاصل ہوتی ہے۔ ان کے برخلاف پٹرول ہلکا اور جلد بھڑک اٹھنے والا سیال مادہ ہے

*نوٹ: دراصل یہ مضمون "زمین کے خزانے" کے عنوان سے ہے۔ اس کا ذیلی عنوان "پٹرولیم کی کہانی" ہے جو "جدید معلومات سائنس" سے لیا گیا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

جو گاڑیوں اور ہوائی جہازوں کو چلانے کے لیے مطلوبہ قوت مہیا کرتا ہے۔ اس سے قدیم زمانے کے لوگ بھی واقف تھے۔ قدیم مؤرخین نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے۔ قدیم چینی لوگ زمین کھود کر تیل نکالتے تھے۔

مصنف کہتے ہیں کہ تیل حاصل کرنے کے لیے چار باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ کسی جگہ مسام دار چٹانیں موجود ہوں جن میں تیل رہتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تیل کو روکنے اور محفوظ کرنے کے لیے اس پر غیر مسام دار چٹانیں بھی ہوں، ورنہ نیچے سے دباؤ پا کر پانی اوپر سے اٹھنا شروع ہو سکتا ہے جو تیل کو آگے دھکیل کر ضائع کر سکتا ہے۔ اس وقت یہ غیر مسام دار چٹانیں تیل کو بکھرنے اور ضائع ہونے سے روک سکتی ہیں۔ تیسرے زمین کی بناوٹ ایسی ہو کہ وہاں دور دور سے تیل سمٹ کر جمع ہو جائے۔ ورنہ بڑے وسیع علاقے میں پھیلے رہنے سے تیل حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور چوتھے یہ کہ ایسا ماخذ بھی ہو جس میں سے تیل نکل سکے۔ یعنی وہاں کسی زمانے میں تیل تیار ہوا ہو اور پھر مناسب جگہوں پر آ کر جمع ہو سکے۔ ایسے مقامات زمین پر بہت تھوڑے ہیں۔ ان مقامات پر آتش فشانی چٹانیں نہیں ہونی چاہییں، بلکہ رسوبی چٹانوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ پھر نیچے ایسی چیزوں کی تہ کا ہونا لازمی ہے جہاں تیل جمع رہ سکے۔

جہاں تیل ہوتا ہے وہاں گیس بھی ضرور ہوتی ہے جو ہلکی ہونے کے سبب تیل کے اوپر رہتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف گیس ملتی ہے، تیل نہیں۔ پاکستان میں سوئی کے مقام پر ملنے والی گیس جس کی ایک مثال ہے۔

حوالۂ سبق: درج ذیل اقتباس میجر آفتاب حسن کے مضمون ''تخلیقِ کائنات'' سے لیا گیا ہے۔

اقتباسات کی تشریح

(۱) ''ہماری زمین اَن مول خزانوں سے بھری پڑی ہے اور ان خزانوں سے جو دولت نکلتی ہے اس میں پٹرولیم ایسی شے ہے جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ جدید دنیا دراصل مشین کی دنیا ہے۔ مشین کے لیے اس وقت تین اہم ذریعے ہیں، بجلی، کوئلہ اور پٹرول۔''

تشریح: مصنف منتخب فن پارے میں کہہ رہے ہیں کہ قدرت نے زمین کے اندر بیش بہا خزانے رکھے ہوئے ہیں۔ یوں تو موجودہ دور میں زمین سے نکلنے والے خزانوں میں سے ہر ایک کی اہمیت ہے، اور موجودہ ترقی میں ان کا کلیدی کردار بھی ہے؛ لیکن دیکھا جائے تو ان میں پیٹرول کی وقعت سب سے زیادہ ہے۔ جدید دور میں صنعتوں کی ترقی عروج پر ہے۔ صنعتی پیداوار بڑھ گئی ہے۔ تجارت پھیلتی جا رہی ہے۔ ذرائع آمد و رفت اور پیغام رسانی کی جدید ایجادات سے دنیا سمٹ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشینوں کی حکمرانی قائم ہے۔ ان سب کے پیچھے بجلی کے ساتھ پیٹرول کا بھرپور حصہ ہے۔

(۲) ''پٹرولیم کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ پرانے لوگ اس سے واقف تھے۔ اِنجیل میں اس کا ذکر موجود ہے قدیم مُؤرخ، ہیروڈوڈس (ہیروڈوٹس)، بابل کے قریب ایک تیل کے چشمے کا ذکر کرتا ہے۔ یہی مُؤرخ بیان کرتا

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ہے کہ جزیرۂ زانٹے میں بھی ایک تیل کا چشمہ ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ دو ہزار سال گزر گئے لیکن زانٹے میں اب بھی تیل موجود ہے۔"

تشریح: مصنف کہتے ہیں کہ پیٹرول کی دریافت قدیم ہے۔ زمین میں پوشیدہ اس خزانے کا ذکر قدیم مورخین نے کیا ہے۔ مذہبی کتابوں میں ابھی اس کا حوالہ ملتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے استعمالات اس زمانے میں محدود تھے۔ تاہم پٹرولیم کی بنا پر آنے والے صنعتی انقلاب سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ انسان اس اہم دریافت جدید دور میں آگاہ ہوا ہے۔ مصنف نے جس قدیم مورخ کا حوالہ دیا ہے، اس کی بات کو وہ مستند خیال کرتے ہیں۔ کیوں کہ جس مخصوص جگہ اس نے تیل کی بابت اشارہ کیا تھا، آج کئی صدیاں گزرنے کے باوجود وہاں تیل موجود ہے۔ جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قدیم دور کے لوگ اس سے واقفیت رکھتے تھے۔

مشق

سوال نمبر۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) زمین سے نکلنے والے خزانوں میں پٹرولیم کی کیا اہمیت ہے؟

(جواب) آج کے جدید دور میں ترقی کا انحصار مشینوں پر ہے۔ اکثر و بیشتر مشینوں، گاڑیوں، ہوائی جہاز اور موٹروں میں پیٹرول استعمال ہوتا ہے۔ پیٹرول زمین سے نکلنے والا وہ خزانہ ہے جو صاف ستھرا، ہلکا اور جلد بھڑک اٹھنے والا ہے۔ تیز رفتار ہلکی مشینوں میں اس کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

(ب) پٹرولیم قدیم دریافت ہے، دو حوالے دے کر ثابت کیجیے۔

(جواب) پیٹرولیم سے قدیم لوگ واقف تھے۔ قدیم مورخ ہیروڈوڈس نے قدیم تاریخی شہر بابل میں تیل کے چشمے کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ پرانی جاپانی اور چینی کتابوں میں معدنی کا تیل کا ذکر ملتا ہے۔

(ج) قدیم دور میں پٹرول کس کس طرح استعمال کیا جاتا تھا؟

(جواب) قدیم زمانے میں تیل جلانے کے علاوہ بطور دوا بھی استعمال ہوتا تھا۔ زخموں پر لگایا جاتا تھا۔ نیز ایک خاص طریقے سے کشتیوں کو پانی کے اثر سے محفوظ کرنے کے لیے بھی کام میں لایا جاتا تھا۔

(د) رسوبی چٹانیں کیا ہیں اور یہ کیسے وجود میں آتی ہیں؟

(جواب) زمین میں تہ بہ تہ جمے ہوئے سنگِ مرمر، ریت پتھر، چونا پتھر، شیل اور دوسرے پتھر رسوبی چٹانیں کہلاتے ہیں۔ یہ چٹانیں لاکھوں سال سمندروں کی تہہ میں رہنے کی وجہ سے عمل میں آئی ہیں۔

(ہ) موجودہ دور میں پٹرولیم کی کیا اہمیت ہے اور اس کے کیا کیا استعمالات ہیں؟

(جواب) پیٹرول کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ آمد و رفت کے جتنے ذرائع ہیں ان سب میں پیٹرول ایک لازمی کی حیثیت رکھتا ہے۔ صنعتوں کو رواں دواں رکھنے میں اس کا کلیدی کردار ہے۔ ہوائی جہاز میں یہ بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے۔ معاشی ترقی کا انحصار پیٹرول پر ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(و) پٹرولیم کی تلاش کے لیے کس قسم کا علاقہ موزوں ہوتا ہے؟

(جواب) پیٹرولیم کی تلاش کے لیے زمین کا وہ حصہ موزوں رہتا ہے جہاں ریت پتھر، چونے کا پتھر، ریت یا اسی قسم کی دوسری شے موجود ہو اور جہاں جمع رہ سکے۔ اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس حصے پر غور کرنا چاہیے جہاں تیل تیار ہوا ہو۔ اس کے بعد زمین کی ایک مخصوص بناوٹ کو دیکھا جائے تو اس طرح تیل کا حصول ممکن ہے۔

سوال نمبر ۲: نشان دہی کیجیے کون سے الفاظ مذکر ہیں اور کون سے مؤنث؟

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
مسام	چٹان	دریا	تہہ
سبب	شکن	تالاب	تفصیل
	بناوٹ		قوت

سوال نمبر ۳: درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے:

(۱) بابل کے قریب تیل کے چشمے کا ذکر کرتا ہے:

(الف) زینوفون (ب) مارکوپولو (ج) ہیروڈوٹس ✓ (د) واسکوڈی گاما

(۲) دنیا کی تیز ترین مشینیں چلتی ہیں:

(الف) کوئلے سے (ب) بجلی سے (ج) پٹرول سے ✓ (د) گیس سے

(۳) کیمیاوی نقطۂ نگاہ سے پٹرولیم چیز ہے:

(الف) سادہ ✓ (ب) پیچیدہ (ج) سخت (د) بے کار

(۴) جہاں تیل پایا جاتا ہے وہاں چٹانیں ہوتی ہیں:

(الف) بھربھری (ب) پتھریلی (ج) نرم (د) مسام دار ✓

(۵) جہاں تیل ہوتا ہے وہاں ضروری نہیں کہ ہوتی ہو:

(الف) مٹی (ب) گیس ✓ (ج) چاندی (د) آکسیجن

سوال نمبر ۴: "توانائی کے اہم ذرائع" کے عنوان پر مضمون تحریر کیجیے۔

توانائی کے اہم ذرائع

انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کے بعد، روایتی کھودنے، چارکول اور وہیل آئل کی بجائے اب توانائی کے اصل ذرائع شمسی توانائی، پن بجلی، ہوا کی طاقت، بائیوماس لیتھیم اور جوہری توانائی وغیرہ ہو گئے ہیں۔ توانائی کے بڑے وسائل میں ہونے والی اس تبدیلی کا احساس تکنیکی ترقیوں کے ذریعے ہوتا ہے، لیکن دوسری طرف، اس طرح کی تکنیکی پیشرفت اس وقت ہوتی ہے جب روایتی وسائل کو حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے، جیسے قیمتوں میں اضافہ یا وسائل کی کمی۔ لہٰذا، توانائی کا وسیلہ کیا ہو سکتا ہے اور کتنا دستیاب ہے اس کا انحصار

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

تکنیکی اور معاشی حالات پر ہے۔ تاہم یہ سچ ہے کہ معیشت کی نشوونما کے ساتھ ہی توانائی کی کھپت آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ اور غریب ممالک میں یہ ایک دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے جہاں ترقی کے مدارج بہت آہستہ آہستہ طے کیے جاتے ہیں۔ اب موجودہ ترقی یافتہ دور میں جو توانائی کے نئے ذرائع سامنے آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

شمسی توانائی: جیسا کہ نام سے پتہ چلتا ہے، یہ توانائی بجلی پیدا کرنے کے لیے سورج کی روشنی کو استعمال کرتی ہے۔ نیز، تکنیکی ترقی کی وجہ سے، شمسی توانائی نے مشہور سولر پینلز اور سولر کاروں کو جنم دیا ہے۔

پن بجلی: توانائی کی سابقہ اقسام کے برعکس، پن بجلی، بجلی پیدا کرنے کے لیے پانی کا استعمال کرتی ہے۔ یہ عمل ڈیم یا پن بجلی گھر میں ہوتا ہے۔

ہوا کی طاقت: اگر ہم قدرتی وسائل کے بارے میں بات کرتے رہے ہیں تو اب ہوا کے بارے میں بات کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ ہوا کی توانائی میں ایک اہم کردار رکھتا ہے، جو ونڈ ٹربائنز یا ونڈ ملز کے ذریعے بجلی پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

لیتھیم: اگلا دور لیتھیم کا ہے۔ دنیا تیزی سے الیکٹرک کاروں کی طرف جا رہی ہے۔ یہ کاریں بیٹری سے چلتی ہیں اور لیتھیم سے بنتی ہے۔ ماحولیاتی تبدیلی کے باعث کئی ممالک تیل سے چلنے والی گاڑیاں بتدریج ختم کرنے جا رہے ہیں۔ لیتھیم کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ تیل ختم ہو جائے تو صرف گاڑیاں بند ہو جائیں گی۔ مگر لیتھیم نہ ہو تو موبائل فون، لیپ ٹاپ اور ٹیبلٹ سے لے کر وہ تمام برقی آلات ناکارہ ہو جائیں گے جو بیٹری سے چلتے ہیں۔

کوئلہ کے ذخائر: کوئلے میں کاربن کا عنصر نمایاں ہوتا ہے جو اس کا ۵۰ فیصد سے زیادہ وزن ۷۰ فیصد سے زیادہ بناتا ہے۔ وہ درخت جو کسی وجہ سے ہزاروں سال پہلے زمین میں دفن ہو جاتے ہیں اور ہزاروں سال بعد حرارت اور دباؤ کی وجہ سے کوئلہ بن جاتے ہیں۔ یہ کوئلے کے ذخائر کا ایک قدرتی ذریعہ ہے۔ ایک سروے کے مطابق تھر میں کوئلے کے ذخائر وافر مقدار میں ہیں، جس کی بنیاد پر یہ دنیا کے لگنائٹ کوئلے کے بڑے ذخائر میں سے ایک ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور تیزی سے پھیلتی ہوئی صنعتوں نے بجلی کی طلب میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ پاکستان کے توانائی کے ذرائع میں کوئلے کا کردار بہت تھوڑا ہے۔ حالانکہ تھر کے صحرا میں موجود خام کوئلہ دنیا میں کوئلے کے بڑے ذخائر میں سے ایک ہے۔ پاکستان میں کوئلے کی طلب رسد سے زیادہ ہے اس لیے ملک کو اپنی ضروریات خاص طور پر صنعتی استعمال کے لیے باہر سے کوئلہ درآمد کرنا پڑتا ہے۔ تھر کے کوئلے کو استعمال کے قابل بنانے کا مقصد اپنے ملک کے اندر موجود کوئلے کے ذخائر سے بجلی پیدا کرنا ہے، تاکہ ملک کا درآمدی کوئلے پر انحصار کم کیا جا سکے اور بجلی کی طلب اور رسد میں موجود خلا کو پُر کیا جائے۔

تمام دنیا میں درج بالا ذرائع سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ اور توانائی پر مزید تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ یقیناً وقت کے ساتھ ساتھ پرانے ذرائع معدوم ہو جائیں گے اور ان کی جگہ توانائی کی نئی ایجادات لے لیں گی۔

کچھ ذریعۂ تعلیم کے باب میں*

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

پیدائش ۱۹۱۶ء۔ وفات ۱۹۹۴ء

تعارف مصنف: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی آگرہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے آگرہ، بدایوں اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے والے پہلے اسکالر تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں دبستان لکھنؤ پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ابتدا میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ ۱۹۴۸ء میں لندن اسکول آف ایشین اینڈ افریقن اسٹڈیز چلے گئے اور شمالی ہندوستان میں ہند-آریا زبانوں پر تحقیق کی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے آئے۔ پہلے لاہور اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ابواللیث صدیقی اورینٹل کالج لاہور اور جامعہ کراچی سے وابستہ ہوئے اور شعبہ اردو کے سربراہ بھی رہے۔ اسی دوران انھوں نے کچھ عرصے اردو لغت بورڈ کراچی کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات بھی سرانجام دیں۔ اس کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔

تصانیف: "تاریخ زبان ادبیات اردو"، "مصحفی اور ان کا کلام"، "تجربے اور روایت"، "لکھنؤ کا دبستان شاعری"، "جرات اس کا عہد اور شاعری"، "بیسویں صدی کا اردو ادب"، "تاریخ زبان و ادب اردو"، "آج کا اردو ادب"، "کلیات مصحفی"، "نظیر اکبرآبادی اس کا عہد"، "رفت و بود" (خودنوشت)، "اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ" وغیرہ اہم تصانیف ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
تصفیہ	فیصلہ	مادری زبان	ماں کی زبان
پدری زبان	باپ کی زبان	ثانوی	دوسری
ارباب بصیرت	باشعور لوگ	تحصیل	حاصل کرنا
عظام	عظیم کی جمع	صوفیائے کرام	نیک پرہیزگار اور بڑے لوگ
علمائے عظام	علم رکھنے والے عظیم لوگ	اسالیب	اسلوب کی جمع۔ تحریر کے انداز
آبیاری	پانی دینا	تنوع	قسم قسم کا ہونا
سایہ عاطفت	مہربانی کا سایہ	ساقط	گرا ہوا/مسترد

*نوٹ: یہ مضمون پہلی مرتبہ سیپ شمارہ 2 میں اور بعد میں ادب اور لسانیات میں شائع ہوا۔

اصطلاحات	اصطلاح کی جمع۔ مُرادی معنی	مفروضہ	فرض، کیے ہوئے/کیا ہوا
مرہونِ منت	احسان مند	مقدم	اہم تر

حوالۂ سبق: یہ اقتباس "کچھ ذریعۂ تعلیم کے باب میں" سے لیا گیا ہے جس کے مصنف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ہیں۔

اقتباسات کی تشریح

(۱) "ذریعۂ تعلیم کے باب میں ہمارے ملک میں گفتگو ہو رہی ہے۔ دنیا کے شاید ہی کسی ملک میں کسی مسئلے کے تصفیے نے اتنا وقت لیا ہو اور بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اب بھی اتنی مدت کے بعد کسی متفقہ فیصلے پر نہیں پہنچے۔"

تشریح: مصنف کہتے ہیں کہ ہمارے وطنِ عزیز میں اس بات پر بحث ہو رہی ہے کہ ذریعۂ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ جب کہ یہ قابلِ بحث بات اصولاً ہے ہی نہیں۔ کیوں کہ یہ فطری بات ہے کہ قوم کی جو زبان ہوتی ہے وہی اس کا ذریعۂ تعلیم بھی ہوا کرتی ہے۔ اپنی زبان میں دی جانے والی تعلیم زیادہ مؤثر اور قوم کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی ملک نے 'ذریعۂ تعلیم کون سی زبان ہو' کو اپنے لیے مسئلہ نہیں سمجھا۔ جب کہ دوسری طرف ہمارے ملک میں صورتِ حال اس کے یک سر مختلف ہے۔ کئی عشرے گزر جانے کے باوجود ہم ابھی تک یہ طے کر نہیں سکے کہ ہم اپنی قوم کے بچوں کو ان کی قومی زبان میں تعلیم دیں یا انگریزی زبان میں۔

(۲) "جب تک فارسی اس ملک کی سرکاری اور دفتری زبان رہی، یہی ہماری علمی اور ادبی زبان رہی لیکن اس کی حیثیت ایک اجنبی اور غیر ملکی زبان کی نہ تھی۔ فارسی یہاں کے لوگوں کے گھروں میں بولی جاتی تھی۔ بعض لوگوں کی مادری یا پدری زبان تھی اور یہاں کے لوگوں کی بھی یہ ثانوی زبان بن گئی تھی اور اتنی عام ہو گئی تھی کہ لوگ اس میں شعر کہتے تھے۔"

تشریح: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں جب بادشاہت کا سلسلہ تھا، اس وقت فارسی کو اولیت حاصل تھی۔ صدیوں تک فارسی ہندوستان میں ایک طاقت ور مرکزی حکومت کی زبان رہی تھی۔ اس مرکزی حکومت کے تحت تمام علاقوں میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی۔ حکمران طبقہ نے فارسی کو رواج دیا۔ اپنے ملک کی سرکاری زبان قرار دیا۔ خط و کتابت، دفتری لکھت پڑھت سب فارسی میں ہونے لگی۔ فطری طور پر اس طبقے کی شعر و ادب کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔ یہاں کے رہنے والے اپنے مقامی بولی کے ساتھ فارسی سے بھی بخوبی واقف تھے۔ فارسی کی جڑیں اس خطے میں اتنی گہری ہو گئیں کہ عوام الناس اسے بولتے اور شعر و شاعری کرتے تھے۔ سرکاری اور ادبی مقاصد کے لیے فارسی کے استعمال نے مقامی زبانوں اور بولیوں کو زیادہ پنپنے نہیں دیا۔

(۳) "پہلے پہل صوفیائے کرام اور علمائے عظام نے اس کی طرف توجہ دی اور اسے برصغیر ہند و پاکستان میں تبلیغِ دین کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا اور پھر اپنی تعلیمات، مریدوں کی تربیت اور تصنیف و تالیف میں اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ اس نے فارسی کے مقابلے میں آنکھیں کھولیں۔"

تشریح: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں کہ اردو کی سرپرستی پہلے پہل صوفیائے کرام اور علمائے کرام نے انجام دی۔ صوفیائے کرام نے

اپنے مسلک کی تبلیغ کے لے مقامی زبانوں کا استعمال کیا۔ انھوں نے اپنی تعلیم اور تبلیغ کے لیے اردو میں کتابیں لکھیں۔ اپنے وعظ میں بھی دینی خیالات کا اظہار اردو میں کرتے تھے۔ اس طرح اس طبقے نے پہلے پہل اردو کی نشوونما میں حصہ لیا۔ لیکن اس کا اثر ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود رہا۔ مرکزی حکوت کے کمزور ہونے سے مقامی زبانوں کو ترقی کا موقع ملا جو کافی عرصے سے رکا ہوا تھا۔ اردو بھی ان زبانوں میں سے ایک تھی۔ اردو کو فارسی سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ پھر وہ وقت بھی نصیب ہو گیا جب اردو ہر طرح کے خیالات کو نظم و نثر میں پیش کرنے پر قادر ہو گئی اور فارسی کے مقابلے میں اپنی حیثیت منوانے لگی۔

(۴) "آج بھی ہمارے بہت سے نادان دوست کہتے ہیں کہ اگر اس قوم نے انگریزی کا زبان کا سایۂ عاطفت چھوڑا تو یہ قوم یتیم ہو جائے گی، جاہل رہ جائے گی۔ دنیا میں کوئی اس کی بات نہ پوچھے گا۔ بین الاقوامی حلقوں میں اس کا اعتبار ساقط ہو جائے گا۔ انگریزی کو چھوڑ کر یہ قوم ذہنی اعتبار سے مُفلس ہو جائے گی۔ علوم وفنون کا جو ذخیرہ انگریزی میں ہے اور اس میں روز بہ روز جو اضافہ ہو رہا ہے یہ قوم اس سے محروم رہ جائے گی۔"

تشریح: ہمارے ملک میں پڑھے لکھوں کا ایک طبقہ انگریزی سے بے حد مرعوب ہے۔ انھوں نے اپنی کج فہمی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ انگریزی کو ترک کر کے قومی زبان میں تعلیم دینے سے قومی ترقی ممکن نہیں ہوگی۔ انگریزی زدہ طبقہ یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس زبان میں مروجہ علوم اور فنی اصطلاحات کا سرمایہ بہت کم ہے جب کہ انگریزی زبان علوم وفنون کے ذخیرے سے مالا مال ہے۔ چنانچہ جب کبھی اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بات ہوتی ہے، ان کی طرف سے مخالفتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مسلسل راگ الاپا جاتا ہے کہ ایسی زبان جو فنی و سائنسی علوم کا ذخیرہ نہ رکھتی ہو کو ذریعۂ تعلیم بنانا غیر مفید ہے۔ بے بنیاد خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی طور پر بھی ہماری حیثیت متاثر ہوگی۔

(۵) "دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی زبان ہو جو اس باب میں اردو کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں نئے الفاظ کے قبول کرنے کی بڑی صلاحیت ہے اور اپنی ساخت اور مزاج کے باعث غیر زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات بھی اس میں بلا تکلف گھل مل جاتے ہیں۔ اس لیے اگر اس کو جدید علوم وفنون کی تعلیم اور تدریس کے لیے اختیار کیا جائے تو یہ اس فرض کو ادا کر سکتی ہے۔"

تشریح: اردو کی خاصیت ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ بآسانی اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ نئے الفاظ شامل ہو کر ایسے گھل مل جاتے ہیں جیسے اس کے اپنے ہوں۔ یہی حال علمی وفنی اصطلاحات کا ہے۔ جدید علوم کی تدریس کے لیے یہ دیکھا جاتا ہے کہ زبان اصطلاحات اور علمی بیان کے اظہار پر قادر ہے کہ نہیں۔ اردو اس معیار پر پورا اترتی ہے اور اس بات کی اہلیت رکھتی ہے کہ اسے ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

(۵) "جو لوگ ایمان داری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ قومی زندگی میں قومی زبان کی کیا اہمیت ہوتی ہے اُنھیں خلوص کے ساتھ اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ کام صرف چند ادارے پورا نہیں کر سکتے، نہ محض حکومت کی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

اِعانت اور سرپرستی ان مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ اسی طرح حل ہوسکتا ہے کہ اسے ایک قومی تحریک کی طرح چلایا جائے۔"

تشریح: جو قوم اپنی قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر نہیں اپناتی، اس کے نونہالوں میں وہ قومی کردار پیدا نہیں ہوسکتا جو اس قوم کے عزائم اور اس کی امنگوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قومی زبان کو قومی زندگی میں اس کا صحیح مقام دینے سے ایک ملک میں رہنے والے مختلف طبقوں میں فکر و ذہن کی یکسانی پیدا ہوتی ہے اور فکر و ذہن کی ہم آہنگی ہی قومی وحدت کی بنیاد ہے۔ جو لوگ اس سچائی سے واقف ہیں انھیں چاہیے کہ اخلاص و ایثار کے ساتھ قومی زبان کی ترقی اور فروغ میں اپنا حصہ ڈالیں۔ یہ کسی ایک فرد یا ایک ادارے کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ بلکہ حکومت کی اعانت اور سرپرستی بھی اس کے لیے درکار ہے۔ اردو زبان کی ترویج کے لیے کی جانے والی کوشش کو اپنا مقصدِ واحد بنانا ہوگا جب ہی بہتر نتائج مل سکیں گے۔

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) **اُردو زبان کی ترقی میں پہلے پہل کن لوگوں نے حصہ لیا؟**

(جواب) اردو زبان کی ترقی میں اولین کردار صوفیائے کرام اور علمائے کرام کا ہے جنھوں نے تعلیم و تبلیغ کے لیے اس کو وسیلۂ اظہار بنایا۔

(ب) **اُردو سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان کا کیا مقام تھا؟**

(جواب) اردو کے رواج پانے سے قبل فارسی کو سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ علمی اور ادبی تصنیفات کی زبان بھی فارسی تھی۔ فارسی کا چرچا اس قدر تھا کہ نہ صرف ثانوی زبان کے طور پر بولی جاتی تھی، بلکہ لوگ اس میں شاعری بھی کیا کرتے تھے۔

(ج) **فارسی کے اثر و اقتدار نے اُردو پر کیا اثرات ڈالے؟**

(جواب) ایک طویل عرصے تک حکمران طبقہ اور شعرا و ادبا کی زبان فارسی رہی۔ اس کا چلن اس قدر عام تھا کہ اُردو جلد پنپ نہ سکی اور اس کی ترقی فارسی کے سبب رُکی رہی۔

(د) **اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے سلسلے میں ہمارے محبانِ قوم کا ایک طبقہ کیا کہتا ہے؟**

(جواب) قوم کا درد رکھنے والے بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اُردو زبان میں علوم و فنون پر لکھی کتابوں اور فنی اصطلاحات کی کمی ہے، نیز اس میں سائنسی مضامین کو بیان کرنے کی استعداد پیدا نہیں ہوئی ہے، اس لیے فوری طور پر اردو کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا جاسکتا۔

(ہ) **اُردو زبان اپنی کون سی خوبی کی بنا پر جدید علوم و فنون کی تدریس کا فریضہ بہ خوبی سرانجام دے سکتی ہے؟**

(جواب) اردو زبان میں ایک حیرت انگیز خوبی یہ ہے کہ اس میں نئے الفاظ اور دوسری زبانوں کی اصطلاحات کو قبول کرنے کی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ نئے الفاظ اردو میں شامل ہو کر اجنبی نہیں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید علوم وفنون کی تعلیم اگر اردو میں دی جائے تو یہ فریضہ وہ بخوبی انجام دے سکتی ہے۔

(و) علمی اصطلاحات کا رواج کیسے ہوتا ہے؟

(جواب) کوئی بھی زبان جب علمی لحاظ سے ترقی پاتی ہے، تو اس کے ساتھ ہی اصطلاحات بھی وجود میں آتی چلی جاتی ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اصطلاحات پہلے مقرر کی جائیں اس کے بعد علوم وفنون پر کتابیں لکھی جائیں۔ جب فنی وسائنسی موضوعات پر تحریری سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں تو اس سے متعلق علمی اصطلاحات بھی رواج پاتی چلی جاتی ہیں۔

(ز) قومی زبان کے نفاذ کا مسئلہ کس طرح حل ہو سکتا ہے؟

(جواب) قومی زبان کے نفاذ کا مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے شعبہ ہائے زندگی سے متعلق اہل علم قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کریں۔ اس کی ترقی اور فروغ میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس کے علاوہ حکومت کو اس سلسلے میں بھرپور سرپرستی کرنا ہوگی۔ اپنی کوشش کو ایک مقصد اور تحریک کے تابع کرنا ہوگا۔

(ح) اردو میں سائنس کی تعلیم وتدریس سے سائنسی میدان میں ترقی ممکن ہے، اس بیان پر اپنی رائے دیجیے۔

(جواب) دنیا بھر کے ماہرین تعلیم ونفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ اپنی زبان کو چھوڑ کر اجنبی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے تو اس سے ذہن کی تخلیقی قوتیں ماند پڑ جاتی ہیں۔ غیر زبان کے وسیلے سے جو معلومات ملتی ہیں ان سے ہماری تخلیقی قوت میں تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ صحیح تعلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قسم کے علوم اپنی زبان میں حاصل کریں اور اپنی زبان میں سوچنے کی عادت ڈالیں۔ حکومت اگر بڑے پیمانے پر جدید سائنسی علوم کی کتابیں اردو منتقل کرنے کی طرف توجہ کرے، نئے تحقیقی مواد کو مسلسل قومی زبان میں شامل کرتے چلے جائیں تو سائنسی میدان میں ترقی ایسی ہی یقینی ہے جیسے سورج کا مشرق سے نکلنا۔

سوال نمبر ۲: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) ہماری علمی زبان تھی:

(الف) **فارسی وعربی ✓** (ب) اردو وعربی (ج) اردو وفارسی (د) اردو، عربی وفارسی

(۲) قومی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہے:

(الف) عوام کی ترقی (ب) **قومی زبان کی ترقی ✓** (ج) علمی وادبی ترقی (د) سرمایہ داروں کی ترقی

(۳) خیالات اور افکار کے اظہار کا ذریعہ ہے:

(الف) **زبان ✓** (ب) علم (ج) تعلیم وتدریس (د) سائنس

(۴) اردو نے پروں سے پرواز کی:

(الف) **فارسی کے ✓** (ب) عربی کے (ج) ہندی کے (د) انگریزی کے

(۵) اردو اور فارسی میں ہے:

(الف) محبت (ب) یگانگت ✓ (ج) اجنبیت (د) یک جہتی

سوال نمبر ۳: اس سبق کا مرکزی خیال تحریر کیجیے:

(جواب) مرکزی خیال: صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد اردو اس مقام پر پہنچ چکی ہے جس میں ہر طرح کے خیالات کا اظہار بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی مخالفت میں جن دلائل کا سہارا لیا جاتا ہے وہ اکثر بے بنیاد ہیں۔ قومی ترقی میں سب سے زیادہ معاون وہاں کی قومی زبان ہوتی ہے۔ اگر قومی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنادیا جائے تو اس میں سائنس وفنون کی تعلیم کی دی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس سمت میں بامقصد کوشش ہو۔

سوال نمبر ۴: درج ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ وتراکیب	جملے
تنوع	مارکیٹ میں اشیا کا تنوع دیکھ کر میں دنگ رہ گیا تھا۔
اعانت	لوگوں کی اعانت کرتے ہوئے کوشش کرنا چاہیے کہ ان کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔
اصطلاح	اصطلاح سازی ایک ضروری امر ہے مگر اس کے لیے علمی معیار بلند ہونا چاہیے۔
سایۂ عاطفت	والد کے مرنے کے بعد اسد نے اپنا لڑکپن چچا کے سایۂ عاطفت میں گزارا۔
اربابِ بصیرت	اربابِ بصیرت غور وفکر کے ذریعے پوشیدہ رازوں کو پالیتے ہیں۔
مفروضہ	یہ بھی ایک مفروضہ ہی ہے کہ بے روزگاری لوٹ مار پر ابھارتی ہے۔

سوال نمبر ۵: "قومی زندگی میں قومی زبان کی اہمیت" کے عنوان پر مضمون تحریر کیجیے:

قومی زندگی میں قومی زبان کی اہمیت

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہر قوم کی اپنی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جو اسے دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ خصوصیات قومی امتیازات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان امتیازات میں زبان بھی ایک بہت بڑا امتیاز ہے۔ ہر قوم کی زبان اس کے مخصوص قومی اور تہذیبی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ اردو ہماری قومی خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔

اردو ہماری قومی زبان ہے۔ قومی زبان کو قومی زندگی میں اس کا صحیح مقام دینے سے ایک ملک میں رہنے والے مختلف طبقوں میں فکری ذہنی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے جو قوم میں اتحاد اور اپنائیت کی مستحکم بنیاد ہے۔ یوں تو وطن عزیز میں علاقائی اعتبار سے بہت سی بولیاں بولی جاتی ہیں، لیکن ان صوبوں میں رابطے کی زبان صرف اور صرف اُردو ہے۔ مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے پاکستانی باشندے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اردو کا سہارا لیتے ہیں۔ اس اعتبار سے پاکستان میں یہی ایک زبان ہے جو باہمی رابطے اور یگانگت کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ اردو کا یہ اختصاص ہے کہ ہماری علاقائی زبانوں میں سے کوئی زبان بھی اردو کی طرح مختلف علوم وفنون کی سرمایہ دار نہیں۔ جو شخص مسلمانانِ پاک وہند کے علوم وفنون، اُن کی تہذیبی روایات، اُن کے درخشاں ماضی اور ان کی دینی وملی تحریکات کا مطالعہ کرنا چاہے، وہ اُردو کے ذخیرے سے صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں بھی اس زبان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا نظریہ اور تحریکِ پاکستان کا تصور ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچانے کے لیے ہمارے سیاسی اکابرین اور دینی رہنماؤں نے اردو کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔ اس دور میں اردو زبان کو متفقہ طور پر قبول کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ برصغیر کے مسلمان صرف اسی زبان کو اپنے ملی افکار اور اسلامی علوم وفنون کے فروغ کا سب سے مؤثر وسیلہ سمجھتے تھے۔ اردو کی یہی وہ ممتاز صفات ہیں جن کی بنا پر پاکستان میں اسے قومی زبان کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے۔

اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہمارے ہر قسم کے تاریخی ورثوں کی امین ہے، اس لیے ہمیں اپنی ملی وحدت اور قومی یک جہتی کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اردو کے ذخیرۂ علم سے روشنی حاصل کرنا ہوگی۔ اردو ہماری پہچان اور وحدت کی علامت ہے۔ اگر ہم نے لسانی اور علاقائی عصبیتوں سے بلند ہو کر واقعی عملی طور پر قومی زبان کا درجہ دے دیا تو صوبوں کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک تسبیح میں پرویا جاسکے گا۔ خدانخواستہ اگر ہم نے اردو کی قومی حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی تو اس سے علاقائیت کے فتنے ابھریں گے، جس سے ہماری فکری اساس کو بڑا دھچکا پہنچے گا۔ ہمارا ملی اتحاد پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گا اور بالآخر اس قومی نظریے کی دھجیاں بکھر جائیں گی جو اردو کی بدولت ہمارے دلوں میں اُترا اور جس کے فیضان سے ہم یہ مقدس وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

سندھی شاعری کے تراجم

ڈاکٹر الیاس عشقی

(محمد الیاس خان یوسف زئی)

پیدائش ۱۹۲۲ء۔ وفات ۲۰۰۷ء

تعارف مصنف: اردو کے ممتاز شاعر، ادیب، مترجم، براڈ کاسٹر الیاس عشقی جے پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ سندھ یونی ورسٹی سے "اردو شاعری پر مغرب کے اثرات" کے عنوان سے اردو میں پی ایچ ڈی کیا۔ الیاس عشقی اردو اور فارسی زبان میں شاعری کرتے تھے۔ الیاس عشقی نے اردو، فارسی اور سندھی ادبیات پر اہم تحقیقی مقالات لکھے۔ علاوہ ازیں ترجمہ نگاری کا حوالہ بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی تحقیق کا اسلوب سادہ ہے۔ نتائج کے حصول میں آپ تحقیقی شواہد کے ساتھ تاریخی حوالوں اور پس منظر کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ حکومتِ پاکستان نے الیاس عشقی کو ادبی وفنی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۰ء میں ستارۂ امتیاز سے نوازا۔

ان کی تصانیف میں: شعرِ آشوب (فارسی)، دوہا ہزاری، گنبدِ بے درد، آوازِ لطیف اور موج موج مہران شامل ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
لسانی	زبان سے متعلق	عصری	زمانے سے نسبت رکھنے والے
تقاضوں	ضرورتوں	مُمِد	مدد کرنے والا
معاون	مددگار	مسودے	مسودہ کی جمع۔ وہ ابتدائی تحریر جسے بعد میں صاف اور صحیح کرنے کی ضرورت ہو
گُر	راز	مشترکات	ایسی باتیں جن میں شرکت ہو (مشترک کی جمع)
سرمایہ کیف	سرور کی دولت	لطیفیات	شاہ عبداللطیف بھٹائی کے متعلق علم
مُعتد بہ	شمار کیا ہوا/ قابل اعتماد	کسبی	کوشش سے حاصل کردہ
مستثنیات	مستثنیٰ کی جمع۔ چنے ہوئے/ وہ چیزیں جنہیں علاحدہ کر دیا گیا ہو	چیزے دگر	خاص چیز

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

اَبیات	بیت کی جمع۔ اشعار	دِل دادہ	عاشق
ابلاغ	پہنچانے کا عمل	مستشرقین	مستشرق کی جمع۔ مغربی عالم یا محقق جن کو کسی مشرقی علم پر عبور ہو
دست رس	قدرت	ثقافت	کلچر
ہم سری	برابری	ہم راہی	ساتھی
فاضلانہ	عالمانہ	بیش تر	اکثر/زیادہ تر
تغزل	غزل کی صورت میں۔ غزل کی خاص خوبیوں کے مجموعے کا نام	خوش آئند	خوش گوار/بھلا معلوم ہونے والا
راقم الحروف	حرفوں کا لکھنے والا	ہمت افزائی	حوصلہ بڑھانا
کما حقہ	جیسا کہ اس کا حق ہے	کلاسکی	قدیمی/اعلیٰ درجے کا
وثوق	اعتماد		

مرکزی خیال: سندھی ادب کسی بھی طرح دوسری زبان کے ادب سے کم تر نہیں۔ سندھی زبان میں ادبی روایت نہایت مستحکم رہی ہے۔ کئی قد آور شعرا و ادبا نے سندھی ادب کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ بالخصوص شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری میں موجود پیغام نے دنیا بھر کے اہلِ علم کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں کلامِ شاہ کے ترجمے کر کے ان کے پیغام کی ترویج کی کوشش ہر عہد میں ہوئی ہے۔

خلاصہ: ترجمہ نگاری ایک انتہائی ذمہ داری کا کام ہے۔ مصنف کے منشا کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنے کے لیے مطلوبہ قابلیت درکار ہوتی ہے۔ سندھی ادب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ابتدا ہی سے گوناگوں خصوصیات کے حامل مترجم میسر آئے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کے فارسی میں منظوم ترجمہ کی روایت موجود ہے۔ مترجمین نے شاہ کے کلام کو مختلف زبانوں میں منتقل کر کے شاہ صاحب کو وسیع حلقے میں متعارف کرایا۔ انگریزی زبان میں ڈاکٹر سورلے کا ترجمہ دلچسپی کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب کے منتخب ابیات کا کثرت سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر اکرم انصاری کا ترجمہ عالمانہ نوعیت رکھتا ہے۔ جی الانہ کے ترجمہ کے علاوہ ایک قابلِ ذکر ترجمہ ایلسا قاضی کا ہے جسے بعض اہلِ علم نے معیاری ترجمہ قرار دیا ہے۔ شاہ جو رسالو کا ترجمہ جرمنی زبان میں ڈھالنے اور جرمن قوم میں متعارف کرانے کا کام این میری شمل نے انجام دیا ہے۔ اردو حلقوں میں کلام شاہ کو متعارف کرانے میں شیخ ایاز اور آفاق صدیقی اہم حوالہ رکھتے ہیں۔ دوسرے کلاسیکی شعرا سچل سرمست، بیدل، شاہ عبدالکرم، شاہ محمد زمان کے کلام کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سندھی ادب کو اردو میں ڈھالنے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

مشق

سوال نمبرا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجئے:

(الف) فن ترجمہ نگاری کسے کہتے ہیں؟

(جواب) کسی ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل ترجمہ نگاری کہلاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک سادہ سی بات ہے، لیکن اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ترجمہ نگاری بھی ایک فن ہے۔ اس فن کا تقاضا ہے کہ مترجم کا علم اور تجربہ وسیع ہو، خاص طور پر اس کتاب کے بارے میں جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہو۔ نیز اصل کتاب کے مصنف کے حالات و نظریات و ماحول سے بھی واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ اصولی طور پر مترجم کو اس فنی تقاضے کو سامنے رکھ کر ترجمہ کرنا چاہیے۔

(ب) اچھے مترجم میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

(جواب) ایک مترجم میں بعض خوبیوں کا ہونا اہم ہوتا ہے۔ مترجم کا علم اور تجربہ اتنا ہو کہ وہ خیالات کو بہتر انداز میں منتقل کر سکے۔ اسے دونوں زبانوں پر مہارت حاصل ہونا چاہیے۔ اصل کتاب کے مصنف کے اسلوب تحریر اور حالات زندگی، اس کے نظریات اور عصری تقاضوں سے باخبر ہونا چاہیے۔

(ج) سندھی زبان کے منظوم ترجموں کا سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

(جواب) سندھی شاعری کے منظوم ترجموں کا سلسلہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کے ترجمے سے شروع ہوتا ہے۔

(د) "شاہ جو رسالو" کا اولین منظوم ترجمہ کس نے کیا؟

(جواب) "شاہ جو رسالو" کا اولین منظوم ترجمہ مولوی ہدایت اللہ نے فارسی زبان میں کیا تھا۔

(ہ) مولانا رومی کون تھے اور شاہ لطیف سے ان کا کیا تعلق تھا؟

(جواب) مولانا رومی فارسی کے عظیم صوفی شاعر تھے جن کی مثنوی آفاقی شہرت کی حامل ہے۔ مولانا رومی اور شاہ صاحب کے کلام میں فکر و فن کے حوالے سے کئی مشترک پہلو ہیں۔

(و) شاہ کے کلام کا جو ترجمہ مسز ایلسا قاضی نے کیا وہ کیوں منفرد ہے؟

(جواب) یوں تو شاہ صاحب کے کلام کے ترجمے بہت سی زبانوں میں ہوئے ہیں، لیکن مسز ایلسا قاضی کا انگریزی ترجمہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کا وزن سندھی بیت کے قریب ہے۔ اس میں قافیے بھی سندھی بیت کی پیروی میں ہمیشہ مصرعے کے آخر ہی میں نہیں بلکہ کبھی مصرع اول اور کبھی مصرع آخر کے درمیان میں لائے گئے ہیں۔

سوال نمبر ۲: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(ا) مترجم کو عبور ہونا چاہئے۔

(الف) زبانوں پر ✓ (ب) عصری تقاضوں پر (ج) حالات پر (د) نظریات پر

(۲) شاہ کے مکمل رسالے کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے:

(الف) شیخ ایاز نے ✓ (ب) رشید احمد لاشاری نے

(ج) ڈاکٹر نجم الاسلام نے (د) فہمیدہ ریاض نے

(۳) جرمن ترجمہ قابل ذکر ہے:

(الف) ایلسا قاضی کا (ب) این میری شمل کا ✓ (ج) جی الانہ کا (د) اکرم انصاری کا

(۴) معیاری ترجمہ کرنے کے لیے واقفیت ضروری ہے:

(الف) زبان اور ادبیات سے ✓ (ب) زبانی اور فنی روایات سے

(ج) ادبی فکر اور فلسفے سے (د) ادبی ذوق اور مطالعے سے

(۵) شاہ محمد زمان لواری کے ادبیات کا اردو ترجمہ کیا ہے:

(الف) نیاز ہمایونی نے ✓ (ب) ڈاکٹر نجم الاسلام نے (ج) ابن انشا نے (د) حفیظ ہوشیار پوری نے

سوال نمبر ۳: دیئے گئے پیراگراف میں واوین کا استعمال کیجیے:

امتیاز صاحب نے ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "توبۃ النصوح" اور ناصر کاظمی کی "برگِ نے" لا کر اپنے طلبہ کو پڑھنے کے لیے دی۔ سرور کو "برگ نے" پسند آئی۔

اردو افسانے کا ارتقاء/ تاریخ

افسانے کی تعریف: مختلف ادوار میں افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں افسانہ ایسی مختصر کہانی کو کہا جاتا ہے۔ جو عموماً ایک نشست میں پڑھی جائے اور جس میں زندگی کے ایک آدھ پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہو۔ اچھا افسانہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

اردو افسانے کا آغاز: ناول کی طرح افسانہ بھی مغرب کی پیداوار ہے۔ اردو کا پہلا افسانہ نگار بالعموم منشی پریم چند کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاہم بعض لوگوں کے نزدیک سید سجاد حیدر یلدرم اس اعزاز کے صحیح حقدار ہیں۔ اور کچھ لوگ سلطان حیدر جوش کو بھی اس زمرے میں شامل سمجھتے ہیں۔

اردو افسانے کے مختلف ادوار: پہلا دور ۱۹۰۰ء تا ۱۹۳۰ء: اس دور میں سب سے نمایاں نام منشی پریم چند کا ہے۔ انہوں نے غریب اور محنت کش عوام کے مسائل کو اپنے افسانوں میں نہایت چابکدستی سے اُجاگر کیا اور قومی زندگی کے تلخ حقائق پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیہاتی زندگی کے ان گنت معاملات کو موضوع بنایا ان کے افسانے فنی طور پر بہت مضبوط ہیں۔ "کفن" ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ اسی دور میں سجاد حیدر یلدرم بھی ہیں جن کا انداز رومانوی ہے جسے انھوں نے مغربی انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے ترکی کے افسانوں کو اردو میں منتقل کیا۔ یلدرم بہترین انشاء پرداز ہیں ان کی تحریر میں عجب دل کشی پائی جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری بھی اسی دور کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک اضطرابی اور ہیجانی کیفیت ہے۔ نیاز سے قریب ترین شخصیت مجنوں گورکھپوری کی ہے جن کے افسانوں میں حزن وملال کی لہر غالب ہے۔

انگارے کی تحریک ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۵ء:

۱۹۳۰ء کے بعد اردو افسانوں میں ایک بڑی تبدیلی یہ پیدا ہوئی کہ دوسری اور غیر ملکی زبانوں کے افسانوں کے ترجمے ہونے لگے اور ہمارے افسانہ نگار مغرب کی بے باکی اور حقیقت پسندی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایک نئی افسانوی تحریک نے جنم لیا جو انگارے کی تحریک کہلائی۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" کے نام سے شائع ہوا جس کے مصنفین نے اپنے افسانوں میں جنسی معاملات پر بے باکی سے اظہارِ خیال کیا اور بعض نئے تجربات کئے گئے۔ پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر اور سجاد ظہیر اس تحریک کے رُوحِ رواں تھے۔

ترقی پسند تحریک ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۷ء:

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند افسانہ نگاروں نے باقاعدہ طور پر ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی اور افسانہ نگاروں اور شاعروں کے لئے ایک نیا لائحہ عمل مرتب ہوا۔ اور اہل ہند کی بدحالی، معاشی پیچیدگیوں، فرسودہ رسم و رواج اور دوسرے مسائل کو بے نقاب کرنا اب افسانوں کا موضوع قرار پایا۔ روس کے اشتراکی انقلاب کے اثرات بھی اس دور کے افسانوں میں نمایاں طور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ زمانہ فنی لحاظ سے اردو افسانے کے عروج کا زمانہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آتی ہے جنھوں

نے اردو افسانے کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اس لئے اس دور کو بلا مبالغہ "اردو افسانے کا سنہرا دور" کہا جا سکتا ہے۔ ناموں کی طویل قطار میں چند نمایاں نام مندرجہ ذیل ہیں۔

کرشن چندر: اردو افسانے کے مہاراج کرشن چندر کے افسانے کشمیر کے دیہاتی ماحول کی عمدہ عکاسی، طبقاتی کش مکش، انسان دوستی، حقیقت نگاری اور اپنی شاعرانہ زبان کی وجہ سے اردو ادب میں لازوال مقام رکھتے ہیں۔ قحط بنگال پر بھی انھوں نے کئی افسانے لکھے۔ "ان داتا" ان کا مشہور افسانہ ہے۔

سعادت حسن منٹو: بے باک افسانہ نگار منٹو کو بعض حضرات اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ ان کا موضوع طوائف اور جنسی رویے ہیں۔ تاہم زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی منٹو نے بڑی کامیابی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اس کی شاندار مثال ہے۔

عصمت چغتائی: باغی افسانہ نگار عصمت چغتائی کے افسانوں میں زندہ اور جیتے جاگتے کردار ملتے ہیں۔ ان کے مکالمے بہت جاندار ہوتے ہیں۔ "چوتھی کا جوڑا" ان کا بے مثال افسانہ ہے۔

راجندر سنگھ بیدی: اردو کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ طبقاتی کش مکش کو انھوں نے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کی منظر کشی عمدگی سے کرتے ہیں۔ "گرم کوٹ" ان کا بہترین افسانہ ہے۔

دیگر ترقی پسند افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، بلونت سنگھ، ابوالفضل صدیقی، شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس وغیرہ زیادہ مشہور ہوئے۔

اسی دور میں ایک اہم نام غلام عباس کا بھی ہے جو ترقی پسند تحریک سے منسلک تو نہیں تھے لیکن اپنے بے مثال افسانے "آنندی" سے اردو افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔

افسانہ تقسیم کے بعد ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۰ء:

برصغیر کی تقسیم نے جن حالات کو جنم دیا اور قتل و غارت گری کا جو بازار گرم ہوا اس کی وجہ سے ایک عرصے تک ہماری معاشرتی اور اخلاقی زندگی انتشار کا شکار رہی، اس کے اثرات اردو افسانے پر بھی پڑے اور فسادات کو موضوع بنا کر کئی عمدہ افسانے لکھے گئے۔ علی عباس حسینی نے "رحیم بابا"، کرشن چندر نے "پشاور ایکسپریس"، احمد ندیم قاسمی نے "پرمیشور سنگھ" قدرت اللہ شہاب نے "یا خدا" اور عزیز احمد نے "کالی رات" جیسے لاجواب افسانوں کے ذریعے فسادات سے پیدا ہونے والے ماحول کی کامیاب عکاسی کی۔

پھر ایسا محسوس ہوا کہ ہمارے افسانہ نگاروں کے پاس فسادات کے موضوع کے علاوہ کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ ایک عرصے کے جمود اور تعطل کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں نے نئے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی، انتظار حسین نے اجتماعی لاشعور کو اپنا موضوع بنایا، قرۃ العین حیدر نے اونچے طبقے کے مسائل پر قلم اٹھایا، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے افسر شاہی۔ بدعنوانی اور متوسط گھرانوں کے معاملات اپنے افسانوں میں شامل کئے۔

اس دور میں بعض نئے افسانہ نگار اُبھر کر سامنے آئے جن میں اشفاق احمد، اے حمید، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، حسن عسکری، شفیق الرحمٰن، واجدہ تبسم، جیلانی بانو، رضیہ فصیح احمد، جمیلہ ہاشمی، قاسم محمود، بانو قدسیہ، آغا اشرف، رام لعل وغیرہ زیادہ مشہور ہوئے۔

اسی دور میں اسلام دوست ادیبوں نے "تحریک ادب اسلامی" کا آغاز کیا اور نعیم صدیقی، جیلانی بی۔اے۔، آثم مرزا، لالہ صحرائی، ابن فرید، نسیم عثمانی وغیرہ نے اسلامی قدروں کو مثبت انداز میں اُجاگر کیا۔

۱۹۶۰ء تا حال:

۱۹۶۰ء کے عشرے کے قریب اردو افسانے کا علامتی دور شروع ہوتا ہے اور افسانے کی تکنیک میں نئے نئے تجربات کئے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ افسانے میں سے کہانی غائب ہوگئی اور صرف علامات رہ گئیں جن کو سمجھنے کے لئے فارسی کا ایک خاص حد تک علم ہونا ضروری تھا۔ لہٰذا یہ دور زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ علامتی افسانے کا زیادہ تر بوجھ انتظار حسین اور ڈاکٹر انور سجاد نے اُٹھایا اور بعض عمدہ افسانے لکھے۔

علامتی افسانے کے زوال کے ساتھ ہی افسانوں میں کہانی واپس آگئی، اس دور میں جو نئے افسانہ نگار افسانے کے افق پر اُبھرے ان میں سلطان جمیل نسیم، اسد محمد خان، احمد ہمیش، امراؤ طارق، جمیل زبیری، زاہدہ حنا، سعیدہ گزدر، حمید کاشمیری، نور الہدیٰ شاہ، یونس جاوید، آغا سہیل، مسعود مفتی وغیرہ زیادہ نمایاں ہیں۔ یہ افسانہ نگار نئے نئے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دے رہے ہیں۔

پچھلے چند برسوں سے افسانہ نگاری میں کمی واقع ہوگئی ہے۔ تاہم بالکل جمود جیسی حالت نہیں ہے۔ افسانہ نگاری کی تاریخ پر سرسری سی نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو افسانہ بہت جلد اپنی ارتقائی منزل طے کر کے عروج پر پہنچا اور اردو ادب کی دیگر اوصاف کی طرح اردو افسانہ بھی اس قابل ہوگیا ہے کہ اسے عالمی ادب میں بلاتردد پیش کیا جاسکتا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

زیور کا ڈبہ

منشی پریم چند (دھنپت رائے)

پیدائش ۱۸۸۰ء۔ وفات ۱۹۳۶ء

تعارف مصنف: اردو ادب میں منشی پریم چند کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے افسانے "کفن" کو اردو کے چند بہترین افسانوں میں سے ایک خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری، اصلاح پسندی، خیر و شر کی باہم کشمکش نظر آتی ہے۔ اُن کے بیشتر افسانے دیہی پس منظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہلکے پھلکے مزاح سے بھرپور کہانیاں بھی لکھیں جو آپ کے افسانوں کے مجموعہ واردات میں شامل ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اُڑا لے جانا	چُرا لینا۔ غائب کر دینا	اقبال کرنا	قبول کرنا۔ اقرار کرنا۔ تسلیم کرنا
اُمنگ	جوش۔ کامیابی کی خوشی۔ بہت خوشی	ایشور	خدا (ہندوؤں کے خیال میں)
آراستہ	سجایا ہوا	آزردہ	خفا۔ ناراض
آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی	نظر ایک مرکز پر نہیں رُکتی تھی	بزاز	کپڑا بیچنے والا
بساطی	گھر کی ضرورت کا سامان پھیری لگا کر بیچنے والا	بنیا	غلے اور پرچون کی تجارت کرنے والا
بھگوان	خدا (ہندوؤں کے خیال میں)	پانی پھیر دیا	محنت برباد کر دی
پنڈتوں	نجومیوں۔ ہندو مذہب کے عالموں	پیش تر	پہلے
پھاڑ کھائے گا	ویران ہو جائے گا۔ ڈراؤنا محسوس ہوگا	چڑھاوا	دُلہن کو زیور پہنانے کی رسم
چُول	لکڑی کا وہ سرا جو دوسری لکڑی میں کاٹ کر کے داخل کیا جائے۔ وہ چھید جس میں دوسری لکڑی ہلائی جائے	چہرہ فق ہونا	خوف یا حیرت کی وجہ سے چہرے کا رنگ بدلنا
حیوانیت	حیوانی خصوصیات۔ جنگلی پن، درندگی	خستہ حال	پریشان حال۔ بدحال

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

خمیازہ اُٹھانا	سزا بھگتنا۔ نقصان یا تکلیف برداشت کرنا	دبے پاؤں	آہستہ آہستہ۔ چپکے چپکے
دھرے رہ گئے	پڑے رہ گئے۔ کسی کام نہ آئے	سیندھ	دیوار میں چوری کے لیے سوراخ یا چھید
شیریں	میٹھا۔ خوش گوار	صلاح	مشورہ۔ رائے۔ تجویز
ضمانت	ذمے داری	ضمیر	دل۔ قلب۔ دل میں موجود اچھائی اور برائی یا صحیح اور غلط میں فرق کرنے کی صلاحیت
طرار	تیز زبان۔ فرفر زبان چلانے والا	طشتری	چھوٹی رکابی یا پلیٹ
غیبی	چھپا ہوا۔ پوشیدہ	کارستانی	چالاکی۔ ہوشیاری۔ شرارت
کُند ذہن	کم عقل	کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا	رشک یا حسد محسوس ہوا، رنج صدمہ یا افسوس ہوا
گرانی	بوجھ۔ بدہضمی	گلا چھڑانا	جان چھڑانا
گل کھلنا	عجیب یا انوکھی بات ظاہر ہونا۔ بھید کھلنا۔ شور مچنا۔ طوفان اُٹھنا	لحاظ	مروت۔ شرم۔ خیال۔ احتیاط
مطلق	بالکل۔ قطعی	معجزہ	وہ بات جس کے کرنے پر انسان قادر نہ ہو۔ وہ انوکھی بات جو نبی سے ظاہر ہو
ملامت آمیز الفاظ	ڈانٹ ڈپٹ والے کلمات	من کی مٹھائی	خیالی خوشی
موٹا کھانے، موٹا پہننے	گھٹیا اور ادنیٰ درجے کا کھانے اور پہننے	وساطت	ذریعہ۔ واسطہ

مرکزی خیال: یہ افسانہ طبقاتی پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے جس کی کہانی چندر پرکاش نامی غریب نوجوان کے گرد گھومتی ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے بعد اچھی سی نوکری کی تلاش میں ہے۔ وہ بیوی چمپا کے ساتھ سنہری مستقبل کے خواب دیکھتا ہے جب کہ اس کا پڑوسی ٹھاکر ایک متمول شخص ہے جو اپنے بچے کی شادی بھرپور شان و شوکت سے کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساری صورت حال اُس کے اندرونی احساس محرومی پیدا کرتی ہے جس نے ہمارے معاشرے کو سخت نقصان پہنچایا ہے، کیوں کہ یہی محرومی لوگوں کو وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جسے جرم کہتے ہیں۔ بے ضمیر لوگ جرم کا راستہ اختیار کر کے برے کہلاتے ہیں جب کہ باضمیر لوگ برائی کے راستے پر قدم رکھنے کے باوجود اچھائی کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

خلاصہ: مندرجہ بالا افسانہ پریم چند کے افسانوی مجموعے "زادِراہ" سے ماخوذ ہے جس میں ہندوستان کے ایک متوسط گھرانے کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ اس افسانے میں عام انسانی، سماجی اور نفسیاتی رویوں کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح انسان اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے حصول کے لیے اخلاقی آویزش اور کشمکش سے گزرتا ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ چندر پرکاش ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد اچھے عہدے پر فائز تھے۔ اسے امید تھی کہ والد کے ذریعے اعلیٰ ملازمت مل جائے گی لیکن والد کی اچانک موت نے اس کے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔ مجبوراً اسے ٹھاکر صاحب کے بیٹے کو ٹیوشن پڑھانی پڑی۔ چندر پرکاش کی بیوی بھی تعلیم یافتہ تھی اور اس کے بھی اونچے خواب تھے۔ وہ پرکاش کی نوکری سے خوش نہیں تھی۔ لیکن جب ٹھاکر صاحب کی طرف سے ان کے گھر کے برابر ہی پرکاش کے لیے گھر کا بندوبست ہو گیا تو کافی حد تک بہتری کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ ٹھاکر صاحب پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے پرکاش سے اپنے بیٹے کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے کچھ خدشات کا اظہار کیا۔ پرکاش نے انھیں مطمئن کرتے ہوئے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ ٹھاکر صاحب نے شادی کی تمام ذمہ داری پرکاش کے سپرد کر دی۔ خرچ کا سارا انتظام بھی اس کے حوالے کر دیا۔ مال اور پیسے کی بہتات نے پرکاش کے قدم ڈگمگا دیے۔ خاص طور پر زیورات کا ڈبہ دیکھ کر اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا جس کا اظہار اس نے اپنی بیوی چمپا سے کیا۔ رات گئے دونوں میاں بیوی زیورات اور شادی کا ذکر کرتے رہے۔ پرکاش کی آنکھوں میں زیور تحت سمائے ہوئے تھے۔ اسے چمپا کی حسرتوں کا بھی احساس تھا۔ منہ اندھیرے وہ خاموشی سے ٹھاکر صاحب کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اگلے دن محلے میں شور مچ گیا کہ چور زیور کا ڈبہ لے اڑے ہیں۔ پرکاش ان کے گھر دوڑا تو سوگ کا سماں تھا۔ پرکاش نے نوکروں پر شبہ ظاہر کیا، لیکن روتی ہوئی ٹھکرائن نے اس کی تردید کر دی۔ البتہ ٹھاکر صاحب پولیس میں رپورٹ درج کروانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پرکاش ٹھاکر صاحب اور بیگم صاحبہ کو تسلی دیتا رہا۔ ٹھاکر صاحب کو کسی طرح بھی پرکاش پر شک نہیں گزرا تھا۔ جلد ہی پرکاش نے وہ گھر بھی چھوڑ دیا۔ اس طرح بہت سے سامان کے ساتھ وہ صندوق بھی پرکاش کے ساتھ چلا گیا۔ چمپا اس مقفل صندوق میں رکھے سامان سے بے خبر تھی۔ ایک دن اُس نے کسی پھیری والے سے پرانی چابیاں لے کر وہ صندوق کھول ڈالا۔ اس پر انکشاف ہوا کہ اس میں وہی زیورات ہیں جو چوری ہو گئے تھے۔ پرکاش سے اس کا جی کھٹا ہو گیا۔ ایک دن پرکاش نے ملازمت کی اسامی کے لیے درخواست دینا چاہی لیکن ضمانت کی خطیر رقم پاس نہ تھی۔ ایسے میں ٹھاکر صاحب نے بڑھ کر اس کی سرپرستی کی۔ ٹھاکر صاحب کے خلوص نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ رہی سہی کسر گھر پہنچنے پر اس کی بیوی چمپا نے پوری کر دی۔ اس نے پرکاش کو شرم دلائی کہ ٹھاکر صاحب کے کیسے کیسے احسانات اور مہربانیوں کا تم نے یہ صلہ دیا۔ ایک دن ٹھاکر صاحب کا گھرانہ پرکاش کے ہاں مدعو تھا۔ پرکاش نے بے حد اصرار کر کے انھیں رات گھر پہ قیام کے لیے روک لیا۔ جب سارے مہمان گہری نیند سو رہے تھے، رات کی تاریکی میں پرکاش اٹھا اور خاموشی سے زیور کا ڈبہ ٹھاکر صاحب کے گھر میں رکھ آیا۔ اگلے دن ٹھاکر صاحب نے یہ خوش خبری سنائی کہ ان کے کھوئے ہوئے زیورات واپس مل گئے ہیں۔ پرکاش کی دعوت ان کے حق میں نیک فال ثابت ہوئی تھی۔ یہ سننا تھا کہ پرکاش کے دل پر سے اچانک بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ گھر لوٹا تو بیوی کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو تھے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

مشق

سوال نمبرا: درج ذیل سوالات کے جوابات تحریر کیجیے:

(الف) چندر پرکاش نے عملی زندگی کا آغاز کس طرح کیا؟

(جواب) چندر پرکاش نے عملی زندگی کا آغاز ٹیوشن پڑھانے سے کیا۔

(ب) کس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹھاکر صاحب چندر پرکاش پر اعتماد کرتے تھے؟

(جواب) پرکاش ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والا تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اپنی شرافت اور اخلاق کی وجہ سے اُسے ٹھاکر صاحب کے ہاں ایک گھر کے فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ ٹھاکر صاحب اسے ایماندار خیال کرتے تھے اور اس پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔

(ج) چندر پرکاش کے ذہن میں بے ایمانی کا خیال کیسے آیا؟

(جواب) چندر پرکاش پر ٹھاکر صاحب نے شادی کے انتظامات کی ذمہ داری لگا رکھی تھی۔ ہزاروں روپے اس کے ہاتھوں سے خرچ ہو رہے تھے۔ زیورات کا ڈبہ دیکھ کر اس کی طبیعت میں لالچ آ گیا۔ کیوں کہ وہ اور اس کی بیوی چمپا دونوں اونچے خواب دیکھا کرتے تھے۔

(د) چندر پرکاش نے ٹھاکر صاحب کا گھر کیوں چھوڑا؟

(جواب) چندر پرکاش کے دل میں چور تھا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اس کے قدموں کے نشان ٹھاکر صاحب کی چھت پر ہیں۔ چنانچہ شبہ کے خوف سے اس نے گھر چھوڑ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

(ہ) ٹھاکر صاحب کے چندر پرکاش پر کسی ایک احسان کی تفصیل بتائیے۔

(جواب) چندر پرکاش پر ٹھاکر صاحب کے کئی احسانات تھے۔ پرکاش کو ملازمت کے سلسلے میں دس ہزار روپے کی رقم بطور ضمانت جمع کرانا تھی اور وہ بالکل تہی دست تھا۔ اس موقع پر ٹھاکر صاحب نے آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیا اور زرِ ضمانت داخل کرادی۔

(و) چندر پرکاش اور اس کی بیوی کے کرداروں کا تقابل کیجیے۔

(جواب) چندر پرکاش اور اس کی بیوی چمپا دونوں ہی اوسط درجے کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے خواہاں تھے۔ ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے اور ساتھ مستقبل کے سہانے خواب دیکھا کرتے تھے۔ چندر پرکاش اپنی ذات میں ایک سچا اور ایماندار آدمی تھا۔ مگر کوئی ایک لمحہ آدمی کے ضمیر کا سودا کر کے اس سے وہ کام کروالیتا ہے جو بعد میں پشیمانی پر منتج ہوتا ہے۔ اپنے اور اپنی بیوی کے روشن مستقبل کے لیے وہ چوری کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کے بعد کہانی کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ چمپا کو زیورات کی چوری کا علم ہوتا ہے تو اس کی طرف سے بھرپور احتجاج سامنے آتا ہے۔ وہ سخت لہجے میں پرکاش کو غیرت دلاتی ہے۔ جب کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عورت ذات کو روپیہ مال زیور

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سے فطرتاً لگاؤ ہوتا ہے۔ اپنی خواہشات کے لیے وہ اپنے خاوندوں کو ناجائز کمانے تک کی ترغیب دے ڈالتی ہیں۔ لیکن چمپا کی مزاحمت اس کی فطرت کی نیکی اور اس کے تصورِ خیر کو واضح کرتی ہے۔ یوں پوری کہانی میں اس کا کردار اخلاقی لحاظ سے چندر پرکاش پر فوقیت حاصل کر جاتا ہے۔

(ز) چمپا کو ایسا کیوں محسوس ہوا کہ اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آیا ہے؟

(جواب) چمپا ایک احسان شناس عورت تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ اپنے محسن کو دھوکہ دینا بدترین جرم ہے۔ جب چندر پرکاش کو اس کا احساس ہوا اور اس نے فوراً اپنے کیے کی تلافی کی تو اسے یوں لگا جیسے اسے وہی نیک دل، ایماندار اور شریف النفس خاوند مل گیا ہے جو اس واردات سے پہلے تھا۔

(ح) افسانہ نگار نے زندگی میں خوشی حاصل کرنے کا کیا طریقہ بتایا ہے؟

(جواب) افسانہ نگار کے نزدیک سچی خوشی مال و دولت میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم پر جس کا جو قرض ہے وہ لوٹا یا جائے، اور جو ہمارا فرض ہے اس کی ادائیگی کی فکر کی جائے۔

سوال نمبر ۲: درج ذیل اقتباسات کی تشریح بہ حوالہ سیاق و سباق کیجیے:

(الف) "پہلے دونوں مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں بات بھی نہ ہوتی۔"

(جواب) **حوالۂ متن:** یہ اقتباس منشی پریم چند کے افسانہ "زیور کا ڈبہ" سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق: یہ افسانہ طبقاتی پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے جس کی کہانی چندر پرکاش نامی نوجوان کے گرد گھومتی ہے۔ جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود زندگی میں ناکامی کا شکار ہے اور اپنی گزر اوقات ٹھاکر صاحب کے بیٹے کو ٹیوشن پڑھا کر کرتا ہے۔ ویرا ندر کی شادی کے موقع پر ٹھاکر صاحب کا حد سے زیادہ اعتماد اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ یہ پیسے والے کس طرح ہمارے احساسات کو مجروح کرتے ہیں۔ یہی سوچ اسے ایک ایسے کام پر آمادہ کر دیتی ہے جو اسے ایسی معاشرتی برائی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ وہ اپنے محسن کو بھی دھوکا دینے سے باز نہیں آتا۔ وہ اپنی بیوی کے لیے اچھی زندگی کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی یہ محرومی اُسے جرم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہی مجبوری ہمارے معاشرے میں موجود بعض لوگوں کی کمزوری بن جاتی ہے جو انھیں جرم کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

تشریح: زندگی کی جدوجہد میں مصروف رہنے والے اپنے بہتر مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ میاں بیوی جو ایک خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں، ان کی بھی فطری خواہش ایسی ہی ہوتی ہے۔ سہانے خواب کی تعبیر کے لیے وہ مشقتیں اٹھاتے ہیں، اور صبر و امتحان کی منزل سے گزرتے ہیں۔ میاں بیوی اگر صالح فطرت ہوں تو ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھتے ہوئے قدم سے قدم ملا کے چلتے ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس چمپا اور چندر پرکاش کے باہم کشیدہ تعلقات کو بیان کر رہا ہے۔ چمپا خیر و شر کی حدود سے واقف ہے۔ اسے معلوم ہو گیا

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ہے کہ اس کا شوہر چندر پرکاش صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا ہے۔ اس صورتِ حال نے چمپا کے دل کو دکھایا ہے۔ اسے چندر پرکاش سے اس اخلاقی و مذہبی جرم کی توقع نہ تھی۔ وہ جی ہی جی میں کڑھ رہی ہے۔ بظاہر خاموشی کی صورت میں ایک مہذب احتجاج کا اظہار کر رہی ہے۔

(ب) "اس کے پاؤں تھرتھرا رہے تھے لیکن جب کانٹا چبھنے کا درد تھا، آج کانٹا نکلنے کا سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا، تب قدم پیچھے ہٹتا تھا لیکن آج آگے بڑھ رہا تھا۔"

(جواب) حوالۂ متن و سیاق و سباق: حصہ (الف) میں ملاحظہ فرمائیں۔

تشریح: چندر پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے گھر زیورات کی چوری کا ارتکاب کیا تھا جس کا بوجھ وہ اپنے ضمیر پر لیے لیے پھر رہا تھا۔ ضمیر کا بوجھ اس وقت مزید بڑھ گیا جب اس کی بیوی چمپا نے اسے عار دلائی اور ٹھاکر صاحب نے ملازمت کے سلسلے میں مدد فرمائی۔ وہ پشیمان حالت میں موقع دیکھ کر چوری کیا ہوا مال واپس وہیں رکھ آتا ہے کہ حقدار را بہ حق رسید۔ جب وہ امانت لوٹا کر واپسی کی راہ لیتا ہے تو طمانیت اس کے وجود میں اتر رہی ہوتی ہے۔ پاؤں گو کہ کانپ رہے ہوتے ہیں، مگر ضمیر کا بوجھ ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ یا تو وہ حال تھا کہ زیورات کا ڈبہ پا کر بھی وہ نہال نہیں تھا، یا اب یہ عالم تھا کہ ڈبہ چھوڑ کر خالی ہاتھ آ رہا ہے اور قلب و ذہن میں سکون اور فرحت کی کیفیت ہے۔

سوال نمبر ۳: افسانہ "زیور کا ڈبہ" کی تلخیص تحریر کیجیے۔

(جواب) تلخیص پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۴: افسانے "زیور کا ڈبا" کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

(جواب) اس افسانے میں پریم چند نے معاشی بدحالی کو جرائم کا سبب بتایا ہے۔ غربت سے ذہنی پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ مگر ضمیر کی خلش اور احساسِ گناہ روحانی ناآسودگی کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ناآسودگی مادی حصول کے باوجود دلی سکون سے محروم رکھتی ہے۔ خیر و شر کی کشمکش میں اگر ضمیر زندہ ہو اور خیر پر استقامت کا جذبہ ہو تو خیر غالب ہو کے رہتا ہے۔ ایک طرف پرکاش ہے جو ایماندار ہونے کے باوجود حسرتوں سے مجبور ہو کر ارتکابِ جرم کرتا ہے، دوسری طرف ٹھاکر اور ٹھکرائن ہیں جو شریفانہ جذبات سے معمور ہیں۔ اگر ان جیسے اوصاف کے حامل افراد کسی معاشرے میں ہوں تو انکی شرافت اور نیکی گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتی روحوں کو روشنی دکھاتی ہے۔ پریم چند نے اس افسانے میں بتایا ہے کہ زندگی کو سکھی اور سہل بنانے کے لیے نیک جذبوں اور اچھے رویوں کو فروغ دینا چاہیے۔ نیکی اور محبت کے میٹھے رویوں کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۵: کیا یہ افسانہ آپ کے شعور میں اضافے کا سبب بنا؟ کیسے؟

(جواب) بلاشبہ منشی پریم چند کا افسانہ ہماری بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس بات پر یقین مضبوط کر دیتا ہے کہ سچ، نیکی، راستی کی بنیاد اگر خلوص پر استوار ہے تو وہ خود کو منوا کے رہتا ہے۔ نیز دلوں کے سکون کا تعلق مال و زر اور زیور و جواہرات سے قطعی نہیں ہے۔ دل کا سکون نیکی میں اور گناہ کی تلافی میں ہے۔ نیز اس افسانے کی بدولت اس پہلو پر توجہ جاتی ہے کہ خوش حال طبقہ

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

بسا اوقات نادانستگی میں مفلس و لاچار لوگوں میں احساسِ محرومی پیدا کر دیتا ہے کہ ان کے قدم غلط سمت میں چل پڑتے ہیں۔ پریم چند نے ٹھاکر صاحب کے کردار کو اسی انداز سے پیش کیا ہے۔

سوال نمبر ۶: آپ کو اس افسانے کے کس کردار نے متاثر کیا اور کیوں؟

(جواب) مجھے اس افسانے کے جس کردار نے متاثر کیا وہ چمپا کا کردار ہے۔ وہ چندر پرکاش کی بیوی ہے۔ اس کے بھی سہانے خواب ہیں۔ لیکن وہ ان خوابوں کی تعبیر جائز طریقے سے چاہتی ہے۔ ناجائز طور پر حاصل دولت پر نہ ریجھتی ہے، نہ ہی لالچ اس کی طبیعت کا حصہ ہے۔ اس کا جھکاؤ خیر کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گناہ سے واقف ہو کر خوش ہونے کے بجائے ناراضی کا اظہار کرتی ہے۔ وہ نہایت حکمت اور تدبر سے اسے گناہ کا احساس دلاتی ہے۔ اپنے رویے سے اس احساس کو اتنا شدید کر دیتی ہے کہ پرکاش اپنے ضمیر سے یہ بوجھ اتار کر پھینکنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ چمپا کا رویہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ایک عورت جسے صنفِ نازک کہا جاتا ہے، شر کے راستے میں سنگِ گراں بن سکتی ہے۔ جب کہ خود کو عقلِ کُل خیال کرنے والا مرد بھی جادۂ مستقیم سے ہٹ سکتا ہے۔ اگر ہر عورت چمپا جیسے کردار و اخلاق کی مالک ہو جائے تو ہمارے معاشرے سے ہوسِ زر، حرص، حرام خوری، رشوت خوری، چوری چکاری کی لعنتیں کافی حد تک ختم ہو سکتی ہیں۔

سوال نمبر ۷: ذیل کے الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ و تراکیب	جملے
صلاح	ایک اہم مسئلے پر غور جاری تھا کہ ایک مردِ زیرک کی صلاح نے سب کو مطمئن کر دیا۔
خستہ حال	خود کو خستہ حال ظاہر کرنے والے بھک منگے تحقیق کرنے پر دھوکے باز ثابت ہوتے ہیں۔
اُڑا لینا	کسی کی اجازت کے بغیر اس کا مال اُڑا لینا نامناسب حرکت ہے۔
کارستانی	اولاد کی کارستانی اور کرتوت پر پردہ ڈالنے والے والدین بعد میں پشیمان ہوتے ہیں۔
دوڑ دھوپ	احمد بہرحال بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔
لحاظ	بڑوں کا لحاظ پیشِ نظر ہو تو چھوٹوں کی ان کے سامنے آنکھ بھی نہ اٹھے۔
جواب دہی	لوگوں کو بلاوجہ ستانے والوں کو آخرت کی جواب دہی سے ڈرنا چاہیے۔
دھوم دھام	جس دھوم دھام سے صاحبزادی کی شادی ہوئی، سب ہی لوگ خوش تھے۔
ضمیر	ایسے بدنصیب بھی ہیں جو چند ٹکوں کے عوض اپنے ضمیر کا سودا کر لیتے ہیں۔
گُل کھلنا	ابھی تو چار دن ہوئے ہیں انھیں آئے ہوئے، دیکھیے کیا گُل کھلتے ہیں آگے چل کر۔

سوال نمبر ۸: درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

الفاظ	متضاد	الفاظ	متضاد	الفاظ	متضاد
شیریں	تلخ	امانت	خیانت	انسانیت	حیوانیت
محتاج	مستغنی	ستم	کرم	-	-

سوال نمبر ۹: درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے:

(۱) چندر پرکاش کو رہنے کے لیے مکان دیا:
(الف) خان صاحب نے (ب) ٹھاکر صاحب نے ✓ (ج) شیخ صاحب نے (د) مرزا صاحب نے

(۲) ٹھاکر صاحب کے بیٹے کا نام تھا:
(الف) کرشن (ب) درشن (ج) ویراندر ✓ (د) ویراد

(۳) زیورات کی مالیت تھی:
(الف) چار ہزار روپے (ب) پانچ ہزار روپے ✓ (ج) چھے ہزار روپے (د) سات ہزار روپے

(۴) پرکاش سے بینک والے ضمانت مانگ رہے تھے:
(الف) پانچ ہزار کی (ب) دس ہزار کی ✓ (ج) بیس ہزار کی (د) تیس ہزار کی

(۵) "زبان پکڑنا" ہے:
(الف) مثال (ب) تشبیہ (ج) روزمرہ (د) محاورہ ✓

www.downloadclassnotes.com

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

بابا نور

احمد ندیم قاسمی

پیدائش ۱۹۱۶ء۔ وفات ۲۰۰۶ء

تعارف مصنف: احمد ندیم قاسمی پاکستان کے نامور افسانہ نگار، شاعر، ناقد، کالم نگار، محقق، مترجم اور صحافی ہیں۔ ان کا اصل نام احمد شاہ تھا، وہ ضلع خوشاب کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا شمار انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں بھی ہوتا ہے۔ انھوں نے اس جماعت کی وابستگی کے حوالے سے کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ وہ پھول، تہذیب نسواں، ادب لطیف، نقوش، سویرا، فنون اور روزنامہ امروز کے مدیر رہے اور متعدد اخبارات میں کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ ۱۹۷۴ء سے اپنی وفات تک مجلس ترقی ادب کے ناظم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی، ستارہ امتیاز اور نشان امتیاز سے نوازا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے انہیں تین مرتبہ آدم جی ادبی انعام عطا کیا۔ بزم فروغ اردو ادب قطر نے انہیں اپنے ایوارڈ سے نوازا تھا اور اکادمی ادبیات پاکستان نے انہیں ۱۹۹۷ء کا کمال فن ایوارڈ اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہونے والے بہترین شعری مجموعے کا علامہ محمد اقبال ایوارڈ عطا کیا تھا۔ انہیں پنجاب کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے افسانے دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نہایت سادگی اور نفاست سے پیش کیا ہے۔ اہم تصانیف میں چوپال، بگولے، طلوع و غروب، آنچل، آبلے، آس پاس، در و دیوار، سناٹا، بازار حیات، برگ حنا، سیلاب و گرداب، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، نیلا پتھر اور کوہ پیما، شامل ہیں۔ تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں تہذیب و فن، پس الفاظ اور معنی کی تلاش اور خاکوں کے دو مجموعے میرے ہم سفر اور میرے ہم قدم شامل ہیں۔ جب کہ شعری مجموعوں میں دھڑکنیں، رم جھم، جلال و جمال، شعلہ گل، دشت وفا، محیط، دوام، لوح خاک، جمال شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی وفات لاہور میں ہوئی۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
بجھی ہوئی آواز	ہلکی، دھیمی آواز	بھونرا	سیاہ رنگ کا ایک بڑا کیڑا
پگ ڈنڈی	جنگلوں یا کھیتوں وغیرہ میں تنگ کچا راستہ	جتنا	بیل گاڑی یا گدھا گاڑی میں لگنا
چٹھی	خط	دستی	ہلکی پھلکی شے جو آسانی سے ہاتھ میں لی جا سکے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

دم بہ خود	چُپ۔خاموش	رنگ فق ہوگیا	پریشانی سے چہرے کی رنگ پھیکی پڑگئی
کُملانا	مُرجھانا۔رونق نہ رہنا۔سوکھنا۔غم گین ہونا	گھرکا	جھڑکا۔ڈانٹا
محراب	کمان کی شکل کا خانہ یا طاقچہ	مداری	بازی گر۔تماشادکھانے والا
مستفید کرنا	فائدہ پہنچانا	مینڈ	کھیت کی منڈیر یا کنارہ
نصیبہ	نصیب۔قسمت۔تقدیر		

مرکزی خیال: یہ افسانہ باپ کی اُس محبت کے جذبے کے گرد گھومتا ہے جو کبھی اپنے سے جدا ہو جانے والی اولاد کی جدائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ چاہے وہ دنیا سے ہی کیوں نہ چلی گئی ہو۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بابا نور نامی ایک دیہاتی بوڑھا ہے جس کا بیٹا برما کی جنگ میں شہید ہو چکا ہے لیکن دس برس گزرنے کے باوجود بھی وہ اُس کے خط کا اُسی بے تابی سے انتظار کرتا ہے کیوں کہ اُس نے اُس کی جدائی تسلیم ہی نہیں کی۔

خلاصہ: بابا نور گاؤں کا ایک سیدھا سادا بوڑھا تھا۔ اکیلا بوڑھا گاؤں میں جہاں گزرتا، لوگ اس کا احترام کرتے۔ دس سال سے اس کا روز کا معمول ڈاک خانے کا چکر لگانے کا تھا۔ کسی کے پوچھنے پر جب وہ بتاتا کہ اس کا رخ ڈاک خانے کی طرف ہے تو بچوں کے لیے یہ ہنسی مذاق کی بات ہوتی۔ سمجھدار لوگ بچوں کو سرزنش کرتے تو وہ روک دیتا۔ وہ نیک دل، معصوم سیدھا سادا بوڑھا تھا۔ اجلے لباس اور سفید داڑھی سے نورانی معلوم ہوتا تھا۔ ایک دن وہ حسب عادت ڈاک خانے کی غرض سے جارہا تھا۔ کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے اسے ایک لڑکی نظر آئی جو درانتی کی مدد سے بڑی مہارت سے گندم کی کٹائی کر رہی تھی۔ وہ لڑکی پاس بیٹھے کسانوں میں سے کسی کی بیٹی تھی۔ بابا نور نے اس لڑکی کی محنت کی تعریف کی۔ اتنے میں وہ لڑکی لسی لے کر آگئی۔ دعا دیتا ہوا وہ وہاں سے رخصت ہوا اور ڈاک خانے کے منشی کے پاس پہنچا جو دیہاتیوں کے فارم بھرتے ہوئے کراچی کی ترقی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ سننے والے حیرت سے سن رہے تھے کہ بابا نور کو دیکھ کر سب کے چہرے بجھ سے گئے۔ آس پاس سے بچوں کی ''بابا نور۔ بابا نور'' کی سرگوشیاں سنائی دینے لگی۔ آتے ہی اس نے اپنے بیٹے کی چٹھی کا پوچھا۔ جواب نفی میں پاکر وہ چپ چاپ الٹے قدم لوٹ گیا۔ جاتے ہوئے بابا نور کو دیکھ کر منشی یہ انکشاف کرتا ہے کہ دس سال پہلے بابا نور کا بیٹا برما کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ خود اس منشی نے سرکار سے ملنے والی یہ افسوسناک خبر بابا نور کو سنائی تھی۔ اس خبر نے بابا نور کے حواس کھو دیے اور وہ پاگل سا ہو گیا ہے۔ وہ اب بھی بیٹے کی چٹھی کا منتظر ہے۔ اگر وہ اگلی بار پھر آیا تو بخدا میں بھی حواس کھو بیٹھوں گا۔

مشق

سوال نمبرا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) بابا نور ڈاک خانے کے چکر کیوں لگاتا تھا؟

(جواب) بابا نور ڈاک خانے اپنے بیٹے کی چٹھی معلوم کرنے کے لیے آتا تھا۔

(ب) بابا نور نے کھیت میں کام کرتی لڑکی کی کیوں تعریف کی؟

(جواب) کھیت میں کام کرنے والی لڑکی نہایت محنت اور مہارت سے درانتی چلا رہی تھی جسے دیکھ کر بابا نور نے اس کی تعریف کی۔

(ج) بابا نور کا افسانے میں بیان کردہ حلیہ اپنے الفاظ میں لکھیے؟

(جواب) اجلے سفید کھدر کے لباس میں ملبوس بابا نور سر پر جو ٹوپی پہنتا تھا، وہ پورے سر کو گھیرے ہوئے ہوتی تھی۔ اس کی سفید داڑھی لمبی تھی جسے وہ بنا سنوار کے رکھتا تھا۔ رنگت زردی مائل، آنکھیں چھوٹی مگر ان کی پتلیاں اتنی سیاہ کہ دیکھنے والوں کو مصنوعی ہونے کا گمان ہوتا۔ بابا نور کے سفیدی میں ڈوبے سراپے میں سیاہ آنکھیں نمایاں محسوس ہوتیں۔ اس کے چہرے پر بچپن کی سادگی اور معصومیت عیاں تھی۔ اس کے کاندھے پر ایک رومال مستقل دھرا رہتا جسے وہ مسجد تک پہنچتے پہنچتے کبھی ایک کاندھے پر اور کبھی دوسرے کاندھے پر رکھتا تھا۔

(د) کس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابا نور کے کردار میں معصومیت، دردمندی اور خیر خواہی کے عناصر موجود تھے؟

(جواب) بابا نور ایک ستم رسیدہ شخص ہے۔ صدمے نے اس کی طبیعت میں منفی ردعمل اور شکایت زمانہ کے بجائے دردمندی پیدا کردی ہے۔ وہ سادہ سا مسلمان ہے جو مسجد و محراب کا بے حد احترام کرتا ہے۔ بچوں پر شفقت کرتا ہے۔ محنت کرنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دنیا کی ہوس آدمی کی طبیعت میں چالاکیاں، مکاریاں، لالچ، سفاکیت، مفاد پرستی اور خودغرضی پیدا کردیتی ہے۔ لیکن بابا نور کے کردار کو دیکھیں تو اسے دنیا سے کسی چیز کی طلب ہے، نہ آسائشوں کی تمنا۔ اسی چیز نے اس کی زندگی کے بے ضرر قرطاس میں معصومیت، دردمندی اور خیر خواہی کے رنگ پیدا کردیے ہیں۔

(ہ) اس افسانے کا انجام ہماری فکر اور احساس پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟

(جواب) اس افسانے کا انجام حزنیہ ہے۔ بابا نور بظاہر دنیا کے معاملات سے بے نیاز نظر آتا ہے اور ڈاک خانے سے ملنے والی اطلاع اس کے لیے محض ایک روزمرہ کی خبر کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن قاری پر اس کے انجام میں پوشیدہ غم کی کیفیت اتنا گہرا اثر ڈالتی ہے کہ معاشرے کے کئی بابا نور اس کے ذہن کے پردے پر ابھر آتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک باپ کی محبت کا ثبوت ہے جو اپنی اولاد کی جدائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ بیٹے کے دس سال پہلے دنیا سے چلے جانے کے باوجود وہ اُس کے خط کا انتظار کرتا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی جدائی کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ نیز اس افسانے کا انجام جنگ کی تباہ کاریوں سے جنم لینے والے انسانی المیے کو بیان کرتا ہے اور ایک ایسا سوال قاری کے ذہن پر چھوڑ جاتا ہے جو اسے امن کے راستوں کی طرف غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

(و) کن باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک دیہاتی ماحول کا افسانہ ہے؟

(جواب) افسانہ ''بابا نور'' گاؤں والوں کی سادہ اور بے داغ زندگی کا دلچسپ مرقع ہے۔ مصنف نے کہانی میں دیہاتی منظر کی کامیاب عکاسی کی ہے۔ کہانی میں اہلِ دیہات کی جفاکشی اور مشقت پسندی کے ذکر کے ساتھ ان کی سادہ انداز کی مہمان نوازی کا ذکر ہے۔ گاؤں والوں کی سادہ اور تکلف سے پاک اور طمع سے دور زندگی کی ایک خوب صورت جھلک نظر آتی ہے۔ مصنف نے موقع محل کی رعایت سے ہرے بھرے کھیت، پگڈنڈی، درانتی، گٹھڑی، کسان، لسی، خاص انداز میں رکھے کٹورے وغیرہ کے بیان سے دیہی ماحول کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال نمبر ۲: درج ذیل اقتباسات کی تشریح بہ حوالہ سیاق و سباق کیجیے:

(الف) پھر وہ بولا، ''ہنسو نہیں بچو۔ ایسی باتوں پر ہنسا نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے پرواہ ہے۔''

سیاق و سباق: مذکورہ بالا عبارت احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''بابا نور'' سے لی گئی ہے۔ اس میں ایک ایسے بوڑھے شخص کی کہانی سنائی گئی ہے جس کے حواس ایک غمناک خبر نے کھو دیے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی چٹھی کا منتظر ہے۔ جب کہ بیٹا ایک جنگ میں مارا جا چکا ہے۔ وہ ہر روز بیٹے کی چٹھی معلوم کرنے ڈاک خانے جایا کرتا ہے۔

تشریح: بابا نور ایک دن حسبِ معمول ڈاک خانے جا رہا تھا کہ آس پاس کھڑے بچوں نے شرارتاً پوچھا کہ بابا نور کہاں جا رہے ہو؟ بابا نور نے اپنی عادت کے مطابق جواب دیا کہ وہ ڈاک خانے جا رہا ہے۔ یہ بات اس کی زبان سے گاؤں والے سیکڑوں بار سن چکے تھے۔ بچوں کے لیے تو یہ ایک طرح کی تفریح اور مذاق کی بات تھی۔ لیکن گاؤں کے سمجھ دار لوگ بابا نور کی دردناک زندگی کے پہلو سے واقف تھے۔ مذکورہ اقتباس میں گاؤں کے ایک سنجیدہ اور سمجھدار آدمی کا جملہ نقل کیا گیا ہے۔ وہ بچوں کو سمجھا رہا ہے کہ مذاق مت اڑاؤ۔ بابا نور کے ڈاک خانے جانے کا ذکر ایسا نہیں جسے سن کر تم ہنسو، قہقہہ لگاؤ اور لطف اندوز ہو۔ گردشِ تقدیر نے اُسے اِس حال پہ پہنچا دیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ مقرر کر لیتا ہے تو اسے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ کسی کا اس پر کوئی زور چل سکتا ہے۔ وہ بے نیاز ہے۔ جیسا چاہتا ہے، اپنے فیصلے کر گزرتا ہے۔

(ب) بابا نور جو کچھ دور گیا تھا، پلٹ کر بولا، ''ڈانٹ کیوں رہے ہو بچے کو۔ ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ ڈاک خانے ہی تو جا رہا ہوں۔''

سیاق و سباق: مذکورہ بالا نثر پارہ احمد ندیم قاسمی کے افسانہ ''بابا نور'' سے لیا گیا ہے۔ نیم پاگل بوڑھا ہر روز اپنے بیٹے کے بارے میں معلوم کرنے ڈاک جاتا ہے جو دس سال پہلے جنگ کی نذر ہو گیا ہے۔

تشریح: گاؤں کے لڑکے بابا نور کو ڈاک خانے جاتا دیکھ کر شرارتاً چھیڑتے تھے۔ مگر بابا نور کو ان کی قطعی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنے حال میں مست تھا۔ وہ لوگ جو بابا نور کا درد سمجھتے تھے، انھیں بچوں کی شرارت گراں گزرتی تھی۔ وہ حسبِ موقع بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر دیا کرتے تھے۔ انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس تھا کہ کسی غمزدہ کا مذاق اڑانے سے روکیں۔ ایسے ہی موقع پر ایک نوجوان نے گاؤں کے شرارتی لڑکوں کو جھڑک دیا۔ معصوم بوڑھا جس پر لڑکوں کی شرارت کا کوئی اثر نہ تھا، الٹا سمجھانے والوں کو سمجھانے لگتا کہ انھیں مت

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ٹوکو۔ انھیں پتا ہے کہ میں ڈاک خانے جارہا ہوں تو اسی بات کا اظہار وہ کر رہے ہیں۔ کچھ غلط تھوڑی کہہ رہے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں ڈاک خانے جارہا ہوں۔

(ج) اس کا رنگ فق ہوگیا اور وہ بجھی ہوئی آواز میں بولا، ''بابا نور آرہا ہے۔'' سب لوگوں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر سب کے چہرے کمھلا گئے۔

سیاق وسباق: درج بالا اقتباس افسانہ ''بابا نور'' سے لیا گیا ہے جس کے خالق احمد ندیم قاسمی ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بابا نور نامی بوڑھا ہے جو اکیلا زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا اکلوتا بیٹا جنگ کے شعلوں کی نذر ہوگیا ہے۔ گاؤں والوں کو اس کے دکھ کا اندازہ ہے۔ خود بابا نور کا حال یہ ہے کہ لوگوں کی شرارت اور ہمدردی سے بے پروا اپنے بیٹے کی چٹھی کے انتظار میں ہے۔ مگر بیٹا زندہ ہی کہاں بچا ہے کہ چٹھی لکھ سکے۔

تشریح: درج بالا اقتباس میں ڈاک خانے کے منشی کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو دور سے بابا نور کو آتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ وہ منشی جو تھوڑی دیر پہلے خوش تھا اور لطف لے لے کر شہر کی ترقی کا حال بتا رہا تھا، بابا نور کو دیکھ کر اسے سانپ سونگھ گیا۔ سارے قصے کہانیاں وہ بھول گیا، لہجے کی خوشی ماند پڑ گئی۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ بابا نور کا بیٹا جنگ میں مارا گیا ہے۔ یہ خبر دس سال پہلے خود منشی نے بابا نور کو سنائی تھی۔ خبر سن کر بابا نور کے دماغ میں خلل آ گیا۔ وہ جس انتظار کی کیفیت میں تھا، آج بھی اسی حالت میں ہے۔ وہ اس امید پر جی رہا ہے کہ اس کے بیٹے کی چٹھی آئے گی۔

سوال نمبر ۳: اس افسانے کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

(جواب) خلاصہ پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۴: اس افسانے کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

(جواب) اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنے بندوں کو مختلف نعمتوں سے نوازا ہے، وہاں انھیں مصائب وآلام میں مبتلا کر کے ان کے صبر وضبط کا امتحان بھی لیتا ہے۔ صبر وضبط سے کام لینا بڑا مشکل ہوتا ہے بالخصوص ان حالات میں جب ہمارا کوئی پیارا ایک ایسی جنگ کی نذر ہو جائے جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اولاد جو ماں باپ کی محبت ، آرزوؤں اور امنگوں کا مرکز ہوتی ہے، ان کی موت والدین کے لیے سخت امتحان ہوتی ہے۔ انسانوں کے پیدا کیے ہوئے جرائم اور جنگوں کے نتیجے میں ماں باپ کے جگر گوشے جس طرح کام میں آتے ہیں اسے محض رضائے الٰہی سمجھ کر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ افسانہ ''بابا نور'' جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثر ایک باپ کی ایسی دردناک کہانی ہے جو انسان شکن جنگوں کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔

سوال نمبر ۵: بابا نور جیسے کسی حقیقی کردار کے بارے میں چند واقعات پر مشتمل کہانی لکھیے۔

(جواب) بابا مسکین ہماری زندگی کا ایک ایسا کردار ہے جسے ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ جب مشرقی پاکستان کے المیے نے جنم لیا تو بابا کی فیملی کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بہترین کاروبار کو تباہ وبرباد کر دیا گیا۔ ان کا ایک بیٹا بلوائیوں سے بچ گیا اور کہیں گم ہوگیا۔ بابا مسکین انتہائی رنجیدہ رہتے تھے۔ اپنے گھر والوں کی ناگہانی موت نے اُن کے دل پر گہرا اثر ڈالا جس کی وجہ سے کبھی

کبھی اُن کی دماغی کیفیت خراب ہوجاتی۔ وہ اپنے بیٹے کی یاد میں روز جیتے اور مرتے تھے۔ جب کبھی اس کیفیت میں شدت پیدا ہوجاتی تو وہ اچانک کسی بھی شخص کو گلے لگاتے اور کہتے "سلیم" تو کہاں گیا تھا، کیسا ہے، میں نے تجھے کتنا تلاش کیا میرے بیٹے۔ پھر تھوڑی دیر بعد جب وہ نارمل ہوجاتے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے۔ اُنھیں ہر نوجوان میں اپنا بیٹا سلیم نظر آتا۔ جس کسی سے گلے ملتے تو اُس سے کہتے ہاں تم بھی میرے بیٹے سلیم کی طرح ہو، ہاں تم بھی میرے سلیم ہی ہو۔ ہر نوجوان شخص میرا بیٹا سلیم ہے۔ بیٹے کی یاد میں اتنے غمگین رہتے کہ ہر چیز بھول جاتے اور ایک دن اچانک اسی طرح اس دنیا سے رخصت ہوگئے جیسے اپنے بیٹے کی تلاش میں کسی لمبے سفر پر نکل گئے ہوں۔

سوال نمبر ۶: درج ذیل واحد الفاظ کی جمع لکھیے:

واحد	جمع	واحد	جمع
کیفیت	کیفیات	مسجد	مُساجد
کمال	کمالات	مدرسہ	مدارس
قدم	اقدام		

سوال نمبر ۷: ذیل کے الفاظ و تراکیب اور محاورے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ و تراکیب	جملے
اجنبیت	والدین اور اولاد کے درمیان اجنبیت کی دیوار خاندانی زوال کی نشاندہی کرتی ہے۔
پگڈنڈی	چین کے ہوا شان پہاڑی سلسلے میں ایک ایسی پگڈنڈی ہے جس پر صرف حوصلہ مند سیاح چل سکتے ہیں۔
دامن بچانا	مشکل گھڑی میں وہ ایسے دامن بچا کر چل دیے جیسے جانتے ہی نہ ہوں۔
زخم سہلانا	وطن دشمنوں کو ایسا سبق سکھایا جائے کہ صدیوں اپنے زخم سہلاتے رہیں۔
دم بہ خود	سچ تو یہ ہے کہ ان کی چوری اور سینہ زوری دیکھ کر سب دم بخود رہ گئے۔
رنگ فق ہونا	حقیقت عیاں ہونے پر چور کا رنگ فق ہوگیا۔
نصیبہ	برسوں کے بیروزگار کا نصیبہ جاگ اٹھا اور اسے عزت کی ملازمت مل گئی۔
مستفید کرنا	استادِ محترم نے طلبہ کو علم سے مستفید کرنے کے بعد سوالات پوچھے۔
سرگوشیاں	ہم جو آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں، خدائے علیم و خبیر کو اس کی بھی خبر ہے۔
ہوا کے گھوڑے پر سوار رہنا	آپ تو ایسے گھوڑے پہ سوار ہیں کہ نہ بیٹھتے ہیں، نہ خدمت کا موقع دیتے ہیں۔

سوال نمبر۹: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) بابا نور دس سال سے جاتا تھا:

(الف) اسٹیشن (ب) ڈاک خانے ✓ (ج) اسکول (د) بازار

(۲) سفید کھدر کا رومال تھا بابا نور کے:

(الف) سر پر (ب) گھر پر (ج) کندھے پر ✓ (د) ناک پر

(۳) لڑکی گندم کے کھیت میں کاٹ رہی تھی:

(الف) سبزی (ب) چارہ (ج) لکڑیاں (د) گھاس ✓

(۴) لڑکی نے بابا نور کے لیے کٹورا بھرا:

(الف) لسی کا ✓ (ب) پانی کا (ج) شربت کا (د) دودھ کا

(۵) "بابا نور" احمد ندیم قاسمی کا تحریر کردہ ہے:

(الف) ناول (ب) ناولٹ (ج) افسانہ ✓ (د) رپورتاژ

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

آب حیات

غلام ربانی آگرو

پیدائش ۱۹۳۳ء۔وفات ۲۰۱۰ء

تعارف مصنف: غلام ربانی آگرو کا شمار جدید سندھی ادب کے نمائندہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ آپ کے یہاں مخصوص دیہاتی روایات، مزاج، نفسیات کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ آپ کیوں کہ اپنے افسانوں میں براہ راست معاشرے کو آئینہ دکھانے کا ہنر جانتے ہیں اس لیے آپ کے افسانے ترجمہ ہو کر اردو کے قارئین میں مقبول ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعے انسان دوستی اور امن ومحبت کا درس دیتے ہیں۔ وہ سادہ اور سلیس زبان لکھتے ہیں کہ عام ذہن کا قاری بھی لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ آپ کی کتابوں میں سندھ کے بچے، سندھ کے دریا، میدان اور پہاڑ، اور پھول گلاب کے وغیرہ شامل ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
ابدی	دائمی۔ ہمیشہ رہنے والی	اطلس	ایک قسم کا ریشمی کپڑا
اللہ توکل	اللہ کے بھروسے پر	امَر	نہ مرنے والا۔ لازوال
آب حیات	وہ روایتی پانی جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُسے پینے سے انسان ہمیشہ کی زندگی حاصل کرلیتا ہے۔ آب بقا	بقا	باقی رہنا۔ ہمیشگی
بین کرنا	مُردوں کی خوبیاں بیان کر کے رونا اور رُلانا	پچھتاوا	افسوس۔ ندامت
پڑاؤ ڈالنا	کسی جگہ قیام کرنا	تکا بوٹی کرنا	ٹکڑے ٹکڑے کرنا
چارہ	تدبیر	جتن	فکر۔ تدبیر۔ کوشش۔ بندوبست
جوگی	ہندو فقیر۔ پجاری۔ جادوگر	چھیلنا	کھال اُتارنا
حلال کیا	ذبح کیا	خداترس	رحم دل
دائمی	ابدی۔ ہمیشہ رہنے والی	دھونی جگانا	آگ لگانا

ڈھیر ہو جانا	مرجانا	رات کے چار پہر	تین تین گھنٹے پر مشتمل رات کے چار حصے
زنبیلیں	ٹوکریاں۔ تھیلے	ساون بھادوں	برسات کا پہلا اور دوسرا مہینہ
ٹپٹا گئے	گھبرا گئے۔ حیران ہو گئے	سچے موتی	اصلی موتی
سراسر	تمام۔ سر بہ سر	سُوئی کا ناکا	سُوئی کا چھید یا سوراخ
شکوہ	شکایت۔ گلہ	طعنہ دینا	بُرا بھلا کہنا۔ ملامت کرنا۔ چھیڑنا
قطب تارا	ایک نہایت روشن تارا	کھوج لگانا	پتا لگانا۔ ٹھکانا معلوم کرنا۔ خبر لگانا
گرتے پڑتے	بڑی مشکل سے۔ جوں توں کر کے	گوشت پوست	گوشت اور کھال
مچھلی کی کلیاں	مچھلی کے کلّے یا جبڑے	مرجان	چھوٹا موتی
مصمم ارادہ	پکا ارادہ	منسوب کرنا	کسی سے نسبت دینا یا تعلق جوڑنا
ناگہانی	اچانک ہونے والی	وابستگی	تعلق۔ رشتہ
ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا	بہت اندھیرا ہونا		

مرکزی خیال: غلام ربانی آگرو کا یہ افسانہ اُن کی سندھی تخلیق ہے جسے ناہید اختر سومرو نے اردو زبان میں منتقل کیا ہے۔ یہ کہانی اُس انسانی جذبے اور ودیعت خداوندی کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جسے زندگی کا اطمینان اور موت کا خوف کہتے ہیں۔ کیوں کہ کائنات میں یہی وہ متضاد حقیقتیں ہیں جو کائنات کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ زندگی کا اطمینان وہ نعمت ہے جسے انسان تو کیا کوئی بھی جان دار کھونا نہیں چاہتا۔ اسی لیے ہر ذی نفس موت کے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان اپنے محسوسات کو الفاظ کی زبان دے سکتا ہے جب کہ یہ خصوصیت کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں لیکن ہم چھلانگیں مارتے ہوئے یا اُڑان بھرتے ہوئے پرندوں اور جانوروں میں زندگی کا اطمینان بھی دیکھ سکتے ہیں اور کسی مرتے ہوئے جانور کی آنکھوں میں انسان جیسا ہی خوف ہمیں نظر آ سکتا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات میں سب سے قیمتی شے زندگی ہے جس کی حفاظت کے لیے انسان ازل سے جدوجہد میں لگا ہوا ہے کیوں کہ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا۔ لہٰذا کسی ایسے آبِ حیات کو ڈھونڈتا رہتا ہے جو اُسے موت کے وار سے بچا کر لے جائے۔

خلاصہ: کہانی نگار لکھتے ہیں کہ وہ دریا نہانے کے لیے پہنچے تو دریا کی روانی نے انھیں حیرت زدہ کر دیا۔ وہ کشتی میں سوار ہوئے تو ملاح سے اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بدلتے موسم میں بھی دریا میں اس قدر پانی ہے، جب کہ سردیوں میں دوسرے دریا خشک ہو جاتے ہیں، تب بھی یہ دریا خوب بہتا ہے۔ اس کی بات سن کر مچھیرا ایک داستان سنانا شروع کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ سندھ میں مہران نام کا ایک شہزادہ تھا جس کی وجہ سے اس دریا کا نام مہران ہو گیا۔ وہ شہزادہ بہت خوب صورت، ذہین اور رحم دل تھا۔ ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا۔ شام ڈھلے اسے ایک ہرن نظر آیا۔ ہرن کو دیکھنا تھا کہ اس نے فوراً اس پہ تیر چلا دیا اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ شہزادہ ہرن کے قریب گیا تو اس کی آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کو اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کھانے کی تیاری کے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

دوران شہزادے نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ زخمی ہرن کی ویران آنکھیں یوں لگتا تھا جیسے کہہ رہی ہوں: آج میں، کل تمھاری باری ہے۔ دسترخوان میں شریک ایک وزیرزادہ نے اس کی یہ بات سن کر سکندرِ اعظم کا ایک قصہ سنایا کہ سکندرِ اعظم اپنے دو وزیروں کے ساتھ آبِ حیات کی تلاش میں نکلا۔ ایک موقع پر تینوں بچھڑ گئے۔ سکندرِ اعظم تو آبِ حیات سے محروم رہا لیکن اس کے ساتھی آبِ حیات پی کر حیاتِ دوام پا گئے۔ وہ آج بھی بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قصہ سن کر ایک جوش کے ساتھ شہزادہ مہران بھی آبِ حیات تلاش کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ چلتے چلتے وہ ایک اندھیرے غار میں داخل ہوتا ہے اور آبِ حیات کا چشمہ پالیتا ہے۔ چشمہ میں ایک مچھلی اس کا استقبال کرتی ہے۔ وہ اسے آبِ حیات پینے سے رکنے کی تلقین کرتی ہے۔ وہ سمجھاتی ہے کہ بلاشبہ آبِ حیات سے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے، لیکن یہ زندگی عذاب سے کم نہیں۔ وہ کہتی ہے جو شخص جس طبیعت کا مالک ہوتا ہے اسے پانی میں ویسا ہی عکس دکھائی دیتا ہے۔ ظالموں کے دلوں کی سیاہی ہزاروں چشمے بھی نہیں مٹا سکتے۔ اگر تم پاک ہو تو تمھیں آبِ حیات کی ضرورت نہیں۔ تمھارا کردار ہی آبِ حیات اور بقا کی ضمانت ہے۔ جب تک حیات کا سلسلہ ہے تم امر ہو گے۔ اس کے بعد وہ نیک حکمرانوں کے اوصاف بتاتے ہوئے کہتی ہے کہ بہترین حکمران وہ ہیں جن کا معیارِ زندگی رعایا جیسا ہو۔ مچھلی کی عبرت انگیز گفتگو سے شہزادہ بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ وہ آبِ حیات پیے بغیر واپس لوٹ جاتا ہے۔ اپنے ملک پہنچ کر وہ عام اعلان کرتا ہے کہ آج سے عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا۔ ملک کے کمزور ترین باشندے کو بھی اس دھرتی پر تحفظ حاصل ہوگا۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا اپنے مثالی انصاف اور رحم دلی کی بدولت عوام کے دلوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ہر شخص کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ لوگ اس کی نیک صفات کی بنا پر کوئی یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ ایک مردِ دانا کی تجویز پر دریا کا نام مہران رکھ دیا گیا کہ یہاں کے رہنے والوں کی زندگی اس دریا کے وجود سے جڑی ہے۔ داستان پوری ہوئی تو کشتی کنارے آ لگی۔ مصنف اتر کر محبت کی نظر سے دریا کو دیکھنے لگا۔

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جوابات دیجیے:

(الف) شہزادے مہران میں کون کون سی خوبیاں تھیں؟

(جواب) شہزادہ مہران سخی، رحم دل، خداترس اور عقلمند نوجوان تھا۔ عدل و انصاف اس کی نمایاں خوبی تھی۔

(ب) شہزادے نے اپنے ساتھیوں کو کیا جواب دیا؟

(جواب) شہزادہ ہرن کا شکار کرنے کے بعد اس کی آنکھیں دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا۔ دوستوں کے استفسار پر اس نے جواب دیا کہ ذبح کرنے سے پہلے ہرن کی حسین آنکھوں میں موت کا ڈر تھا۔ اس کی وحشت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہر شخص کو فنا ہے۔ جینے والا بھی نہ کبھی تو موت کے شکنجے میں آئے گا۔

(ج) وزیرزادے نے آبِ حیات کی کیا خاصیت بیان کی؟

(جواب) وزیرزادے نے آبِ حیات کی خاصیت یہ بتائی ہے کہ یہ ایسا خوشبودار، میٹھا سفید رنگت کا پانی ہے جسے کوئی پی لے تو ہمیشہ کی زندگی پالیتا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(د) غار میں شہزادے مہران کی ملاقات کس سے ہوئی؟

(جواب) غار میں شہزادے کی ملاقات ایک مچھلی سے ہوئی۔

(ہ) مچھلی نے شہزادے کو کیا نصیحت کی؟

(جواب) مچھلی نے شہزادے کو نصیحت کی کہ تم ایک حکمران ہو۔ آبِ حیات پی کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کے بجائے اگر رعایا کی فکر کرو، ان کے فقر و فاقے کو ان سے دور کرو، ان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہو تو تم امر ہو کر ہر زمانے کے لیے ایک مثال بن جاؤ گے۔

(و) شہزادے کی موت پر ہر آنکھ کیوں اشک بار تھی؟

(جواب) شہزادہ مہران ایک نیک دل اور انصاف پسند حکمران تھا۔ مظلوموں کے لیے اس کا وجود ایک ڈھارس تھا۔ اس کی حکومت رعایا کے دلوں پر تھی۔ اس کی خوبیوں کے باعث ہر شخص اس کے ساتھ قلبی لگاؤ رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے مرنے پر ہر شخص یوں رو رہا تھا جیسے اس کا کوئی قریبی عزیز دنیا سے رخصت ہوا ہو۔

(ز) دریا کا نام مہران کیوں رکھا گیا؟

(جواب) شہزادہ مہران کے بعد لوگ اس کے نام پر کوئی یادگار قائم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے چاہا کہ اس کا نام ایک ایسی چیز سے منسوب کریں جو رواں دواں ہو اور جس میں ہم سب کی زندگیاں پوشیدہ ہوں اور وہ قائم و دائم بھی ہو۔ تو ان کے ذہن میں دریا کا خیال آیا اور انھوں نے اسے شہزادہ مہران کے نام سے موسوم کر دیا۔

(ح) اس کہانی سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟

(جواب) اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہر شخص کو بالآخر مرنا ہے۔ بقول غالب:

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — پھر اسے مرنا ہے حضرت سلامت

تو پھر کیوں نہ ہم لوگوں کے کام آئیں، غریبوں کا سہارا بنیں، مظلوموں کی طاقت اور ظالموں، جابروں کے لیے پیغامِ اجل؛ تا کہ رہتی دنیا تک لوگوں کی زبانوں پر ہمارا نام ہو۔ بقول میر:

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

سوال نمبر ۲: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) انسان کے ہاتھ میں ہے:

(الف) تدبیر ✓ (ب) تقدیر (ج) تقریر (د) تعبیر

(۲) آبِ حیات پینے سے مل جاتی ہے:

(الف) ابدی بادشاہت (ب) ابدی حیات ✓ (ج) ابدی عزت (د) ابدی دولت

(۳) شہزدے مہران کے نام سے منسوب کیا گیا ہے:

(الف) سکہ (ب) مینار (ج) محل (د) دریا ✓

(۴) شہزادے نے ہمیشہ کی زندگی پائی:

(الف) آب حیات پی کر (ب) حکومت کرکے (ج) لوگوں کی خدمت کرکے ✓ (د) جنگ کرکے

(۵) انسان کی روح کا آئینہ ہوتی ہے:

(الف) آنکھ ✓ (ب) زبان (ج) سوچ (د) ہمدردی

سوال نمبر ۳: درج ذیل الفاظ میں متضاد اور مترادف جوڑے الگ الگ کرکے لکھیے:

مترادف	متضاد	مترادف	متضاد
کالا، سیاہ	موت، زندگی	بوڑھا، جوان	خشکی، تری
نیکی، اچھائی	دن، رات	شرم، حیا	-

سوال نمبر ۴: درج ذیل عبارت کی تشریح بہ حوالہ متن کیجیے:

(الف) "اب یہ یقین کرنے کے لیے کہ نیکی تمھارا پھل ہے یا بدی، اس پانی میں دیکھو۔ اس پانی میں بھی اور اُس پانی میں بھی جو انسان کی آنکھوں میں ہوتا ہے۔"

(جواب) **حوالۂ متن:** درج بالا اقتباس غلام ربانی کے افسانے ''آبِ حیات'' سے لیا گیا ہے۔

تشریح: مصنف نے شہزادہ مہران کی کہانی بیان کی ہے کہ وہ آبِ حیات کی تلاش میں نکلا۔ جب وہ چشمے تک پہنچ گیا تو اس کی ملاقات ایک مچھلی سے ہوئی۔ مچھلی نے شہزادے کے ارادے کو جان کر اسے قیمتی نصیحت کی۔ اس نے کہا کہ یہ آبِ حیات تو آدمی کے اخلاق و کردار کا عکس ہوا کرتا ہے۔ کوئی برا ہے تو بھی اس سے فیض اٹھا سکتا ہے، مگر اس کی زندگی اس کے لیے راحت کا پیغام کم، اور دائمی عذاب زیادہ ہوگی۔ وہ شخص جس نے سچائی اور رحم دلی کو اختیار کیا ہوگا یہی آبِ حیات اسے ابدی مسرت والی حیات بخش دے گا۔ لہٰذا اپنے باطن کو دیکھ کر فیصلہ کرو۔ تمھارا باطن آبِ حیات میں بھی دکھائی دے گا اور مخلوقِ خدا کی آنکھوں کے پانی میں بھی۔

(ب): **"اگر تمھاری روح پاک ہے تو پھر تمھیں کسی بھی آبِ حیات کی ضرورت نہیں۔"**

حوالۂ متن: درج بالا اقتباس غلام ربانی کے افسانے ''آبِ حیات'' سے لیا گیا ہے۔

تشریح: شہزادے مہران کا ایک مچھلی سے مکالمہ آبِ حیات کے چشمے پر ہو رہا ہے۔ مچھلی اسے بصیرت افروز اور گراں قدر نصیحت عطا کر رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ آدمی کو اپنی روح پر محنت کرنا چاہیے۔ بد باطن لوگوں اور سیاہ کاروں کے لیے آبِ حیات کے ہزاروں چشمے بھی ناکافی ہیں۔ البتہ جن کی آنکھ میں حیا اور شرم ہو، ان کے رویوں میں ہمدردی کا عنصر ہو اور رحم دلی ان کا شعار ہو تو انھیں کسی آبِ حیات کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگ مخلوقِ خدا کے دلوں میں دھڑکتے ہیں۔ ان کی محبوبیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ مر کر بھی امر ہو جاتے ہیں اور ہر زمانے کے لیے وہ مثال بن جاتے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سوال نمبر ۵: درج ذیل الفاظ اور محاورے اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ اور محاورے	جملے
ہوا سے باتیں کرنا	نہایت حسین اور پھرتیلا گھوڑا، دوڑتا کیا تھا، یوں سمجھو ہوا سے باتیں کرتا تھا۔
اماوس	اماوس کی رات تھی، جب ہم بھیگتے ہوئے اسٹیشن پہنچے۔
ڈھیر ہونا	قانون کے شکنجے کے سامنے سارے ڈاکو ڈھیر ہو گئے۔
حلال کرنا	بدلتی ہوئی اقدار نے بہت سی حرام چیزوں کو حلال کر ڈالا ہے۔
تکابوٹی کرنا	امیر شہر چاہتے تو باغیوں کی تکابوٹی کر سکتے تھے، مگر انھوں نے رحم دلی کو ترجیح دی۔

اردو ڈرامے کا ارتقاء

ڈرامے کی تعریف: ڈرامہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "کر کے دکھانا" یہ ایک غیر ملکی صنف ہے جو انیسویں صدی میں داخل ہوئی۔

ڈرامے کی ابتداء: ڈرامے کی ابتداء سب سے پہلے یونان سے ہوئی اور پھر یہ دیگر یورپی اقوام میں پھیلا۔

سنسکرت ڈرامے: اردو ڈراموں سے پہلے سنسکرت میں مذہبی اور دیو مالائی ڈرامے دکھائے جاتے تھے ان میں رام لیلا اور شکنتلا وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن یہ فنی اعتبار سے ڈرامے کی تعریف پر پورے نہیں اترتے ان کو ڈراما کہنا ذرا مشکل ہے۔

اردو ڈرامے کی ابتداء: اردو ڈرامے کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات ہیں اور مختلف محققین نے مختلف ڈراموں کو اردو کا پہلا ڈرامہ قرار دیا ہے مثلاً:

شکنتلا: کالی داس کے لکھے ہوئے اس ڈرامے کی داستان کا اردو ترجمہ کاظم علی جوان نے ۱۸۰۱ء میں کیا مگر یہ ڈرامہ نہیں داستان ہے۔

رادھا کشن کنہیا: اسے تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ نے لکھا اور خود ہی اسے اسٹیج بھی کیا اور کشن کنہیا کا کردار بھی خود ادا کیا۔

اندر سبھا: اسے بھی واجد علی شاہ کے دور میں امانت لکھنوی نے لکھا اور ۱۸۵۳ء میں اسے بار بار اسٹیج کیا گیا۔ امانت لکھنوی کے اس مشہور ڈرامے کو بے حد شہرت حاصل ہوئی اور دوسرے لوگوں نے بھی "اندر سبھا" لکھیں) بیشتر لوگوں کی رائے میں "اندر سبھا" ہی اردو کا پہلا با قاعدہ ڈرامہ کہلانے کے لائق ہے)۔

پارسی تھیٹر: اندر سبھا کی مقبولیت دیکھ کر پارسیوں نے جو کاروباری ذہنیت رکھتے تھے با قاعدہ تھیٹریکل کمپنی قائم کی نیز بمبئی، کلکتہ اور دہلی میں تھیٹر قائم کیے گئے۔

جدید ڈرامہ نگاری: جدید ڈرامہ نگاری کا سہرا میاں حسین ظریف کے سر ہے۔ ان کے مشہور ڈراموں میں خدا دوست اور چاند بی بی وغیرہ شامل ہیں۔ ظریف کے علاوہ رونق بنارسی، بیتاب دہلوی، طالب بنارسی اور احسن لکھنوی بھی اس دور کے مشہور ڈرامہ نگار ہیں۔

تراجم کا دور: احسن لکھنوی نے شیکسپیئر کے کئی ڈراموں کے ترجمے جن میں ہیملٹ، "مرچنٹ آف وینس"، "رومیو جولیٹ" اور "انیر یو لائک اٹ" خاصے مشہور ہوئے۔ اب تک جو ڈرامے دکھائے جاتے تھے ان میں مکالمے زیادہ تر منظوم ہوتے تھے۔ ان میں ناچ گانوں کی بھرمار ہوتی تھی اور زبان اردو، ہندی کا ملغوبہ ہوتی تھی۔

آغا حشر کاشمیری: آغا حشر اردو کے وہ پہلے ڈرامہ نگار تھے جنھوں نے ڈراموں میں ادبی انداز اور معیار کا خیال کیا اور اس کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ ان کے ڈراموں کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے جاندار مکالمے ہیں۔ ان میں جذبات کی شدت پائی جاتی ہے۔ ڈرامے کے اتار چڑھاؤ میں اشعار کا کامیاب اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ آغا حشر کے مشہور ڈراموں میں خوبصورت بلا، سفید خون، ترکی حور، آنکھ کا نیک پروین، یہودی کی لڑکی اور رستم و سہراب شامل ہیں۔

علمی و ادبی ڈرامے: آغا حشر کے ساتھ ہی ڈراموں کا زوال شروع ہو گیا اور ان کی جگہ علمی اور اعلیٰ قسم کے ڈراموں نے لے لی اور اردو کے مشہور ادیبوں نے بھی ڈرامے لکھے مثلاً:

۱۔ جنگ روس و جہاں: (اسے مولانا ظفر علی خان نے لکھا)
۲۔ شہید وفا: عبدالحلیم شرر کی قلم سے نکلا۔
۳۔ زود پشیمان: (مولانا عبدالماجد دریابادی نے تحریر کیا)
۴۔ زخمی پنجاب: عظیم افسانہ کرشن چندر نے لکھا۔
۵۔ باپ کا گناہ: یہ ڈرامہ بہت مشہور ہوا اسے حکیم احمد شجاع نے لکھا۔

ان کے علاوہ عابد حسین، اشتیاق حسین قریشی، پروفیسر مجیب وغیرہ نے بھی ادبی ڈرامے لکھے۔

امتیاز علی تاج: آغا حشر کے بعد اردو ڈرامے کے ارتقاء کی سب سے اہم کڑی "امتیاز علی تاج" ہیں جن کا لازوال ڈرامہ "انارکلی" اردو ڈرامے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم یہ بے مثال ڈرامہ کبھی اسٹیج نہ ہو سکا کیونکہ اس کے بعض مناظر (خصوصاً باغ وغیرہ کے مناظر) کو اسٹیج پر دکھانا ممکن نہیں تھا۔

ترقی پسند ڈرامہ نگار: اردو کے ترقی پسند ڈرامہ نگاروں میں عظمت چغتائی، منٹو، خواجہ احمد سردار جعفری، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ نے بھی ڈرامے لکھے مگر وہ اسٹیج پر دیکھنے سے زیادہ پڑھنے کی چیز ہیں۔

یک بابی (one act) ڈرامہ: یک بابی ڈراموں کے سلسلے میں جن لوگوں نے نام کمایا ان میں عابد حسین، پروفیسر مجیب، اشتیاق حسین قریشی، جلیل قروائی اور سب سے بڑھ کر مرزا ادیب سے بہتر یک بابی ڈرامہ لکھنے والا اردو میں کوئی نہیں ہے۔

قیام پاکستان سے پہلے سینما ایجاد ہو چکا تھا اور اسٹیج کا دور ختم ہو چکا تھا تاہم پاکستان میں چند لوگوں نے جن میں رفیع پیرزادہ اور خواجہ معین الدین سرفہرست ہیں۔ ڈرامے کو سنبھالنے کی کوشش کی خصوصاً خواجہ معین الدین نے اس فن کو فروغ دیا۔ ان کے ڈرامے "مرزا غالب بندر روڈ پر"، "لال قلعہ سے لالوکھیت" اور "تعلیم بالغاں" اعلیٰ درجہ کے ہیں اور مقبول بھی بہت ہوئے۔ عشرت رحمانی لکھتے ہیں "خواجہ معین الدین نے اسٹیج ڈراموں کو ایک بار پھر سے زندہ کر دیا"۔

فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا دور: سینما، ریڈیو اور ٹی وی نے اسٹیج کی رہی سہی اہمیت بھی ختم کر دی۔ اب ڈرامہ اسٹیج سے نکل کر فلم کے پردے، ریڈیو کی لہروں اور ٹی وی کی اسکرین پر آ گیا ہے۔ خصوصاً ٹی وی پر نہایت اعلیٰ معیار کے ڈرامے پیش کیے گئے۔ ٹی۔ وی۔ کے مشہور ڈرامہ نگاروں میں، ڈاکٹر انور سجاد، اشفاق احمد، حمید کاشمیری، فاطمہ ثریا بجیا، انور مقصود، شاہد کاظمی، امجد اسلام امجد، نور الہدا شاہ، اصغر ندیم سید، عبدالقادر جونیجو اور ڈاکٹر یونس بٹ وغیرہ نے ہر موضوع پر اعلیٰ معیار کے ڈرامے تحریر کئے ہیں۔

موجودہ اسٹیج ڈرامے: موجودہ دور میں مزاحیہ اسٹیج ڈراموں نے خوب شہرت حاصل کی ہے۔ لیکن اس میں گھٹیا ہنسی مذاق پایا جاتا ہے اور ادبی معیار نام کو بھی نہیں ہوتا۔ تاہم عوام کی بڑی تعداد ان ڈراموں کو دیکھتی ہے۔ مثلاً عمر شریف وغیرہ کے ڈرامے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

میدانِ جنگ

آغا حشر کاشمیری

پیدائش ۱۸۷۹ء۔ وفات ۱۹۳۵ء

تعارف مصنف: اردو ڈرامے کے میدان میں آغا حشر کاشمیری کی برتری سب مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فن کو زمانے کی ضرورت کے مطابق ڈھال کر پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ڈرامہ نگاری کا ہر دور ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے ابتدائی، ڈرامے شاعرانہ اندازِ بیان لیے ہوئے ہیں جو اس وقت عوام میں مقبول تھا۔ مکالموں میں نظموں کا سا آہنگ، ڈرامائیت، خطابت، بلند آہنگی، مقفٰی و مسجع ترکیبیں اسی دور کی دین ہے۔ بعد کے ادوار میں انھوں نے کوشش کی کہ مکالموں میں زیادہ سے زیادہ فطری اور حقیقی رنگ دیا جائے۔ انھوں نے عوام کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے ابتداً روایتی اور تاریخی موضوعات پر ڈرامے لکھے تھے، وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے گرد و پیش کی معاشرتی زندگی کے معاملات کو بھی اپنے فن پاروں کو موضوع بنایا۔ ان کے مشہور ڈراموں کے نام یہ ہیں۔ سفید خون، اسیر حرص، یہودی کی لڑکی، رستم و سہراب، صید ہوس۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اَجَل	موت۔ مرگ	پاش پاش	ٹکڑے ٹکڑے
پروردگار	پرورش کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ	پھولتی پھلتی	آباد۔ خوش حال
جلاّد	ظالم۔ بے درد۔ قاتل	چراغ بجھانا	نیست و نابود کرنا
خوں خوار	ظالم	دہائی دے کر	قسم دے کر
سام	ایک ایرانی پہلوان۔ رستم کا دادا	سجدہ ہائے نیاز	وہ سجدے جن میں عاجزی اور محبت ہو یا کوئی حاجت اور خواہش ہو
شرم رکھنا	عزت بچانا	کمر توڑنا	مایوس کرنا
گھات میں ہونا	موقع تاکنا۔ دشمن کو مارنے کے لیے چھپ کر بیٹھنا	بھونک دینا	کوئی نوک دار چیز جسم میں گھسانا۔ گھونپ دینا
لال	بیٹا۔ فرزند	نریمان	ایک ایرانی پہلوان۔ رستم کا پردادا
نیند ٹوٹ گئی	آنکھ کھل گئی	منت	عاجزی۔ خوشامد۔ التجا

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

موذی	زہریلا۔ ہلاک کرنے والا۔ ایذا دینے والا	مہرہ	ایک قسم کا پتھر

رستم وسہراب کا قصہ: رستم وسہراب کا قصہ فارسی شاعر فردوسی کے شاہنامے سے ماخوذ ہے۔ خود فردوسی نے شاہنامے کے تمام قصے قدیم ایران کی روایتوں سے حاصل کیے تھے۔ پورے شاہنامے میں ڈرامے کے نقطۂ نظر سے مؤثر ترین حصہ رستم وسہراب کا قصہ ہے۔
رستم موجودہ افغانستان کے علاقے کا ایک بہادر اور قومی سردار تھا جو شاہِ ایران کا وفادار اور جاں نثار تھا۔ ایران سے توران کی دشمنی بہت پہلے سے چلی آتی تھی۔ تورانی بادشاہ کی کوشش رہا کرتی تھی کہ ایران کو شکست دے، لیکن رستم کی بدولت اس کی یہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اِدھر ایک بار رستم نے تورانی علاقے کی ایک شہزادی سے شادی کر لی۔ مگر مسلسل جنگوں میں مشغول رہنے کے باعث اسے اپنے ساتھ نہ لے جا سکا البتہ بیوی کے پاس ایک تعویذ بطور نشانی چھوڑ گیا تاکہ اگر اس سے اولاد ہو تو وہ تعویذ اس کے بازو پر باندھ دیا جائے۔

رستم کو پھر موقع نہ مل سکا کہ آ کر بیوی کو لے جاتا۔ اس کے جانے کے بعد اس کا لڑکا سہراب پیدا ہوا۔ مگر رستم کو اس نے اطلاع بھیجی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ کیوں کہ بیوی کو اندیشہ تھا کہ لڑکا پیدا ہونے کی اطلاع پا کر رستم اسے بھی اپنے پاس بلا لے گا اور جنگوں میں لگا دے گا۔ اس طرح وہ شوہر کے بعد اپنے بیٹے سے بھی محروم ہو جائے گی۔

ادھر جب سہراب جوانی کی عمر کو پہنچا اور باپ ہی کی طرح طاقتور جنگجو اور دلیر بن کر اٹھا تو بادشاہ توران نے یہ سازش کی کہ دونوں باپ بیٹوں کو بے خبری میں آپس میں لڑوا دیا جائے۔ اس طرح اگر رستم مارا گیا تو ایرانی طاقت ختم ہو جائے گی اور اگر سہراب مارا گیا اور بعد میں رستم کو معلوم ہوا کہ یہ اس کا بیٹا تھا تو اس صدمے سے وہ اس قدر نڈھال ہو جائے گا کہ پھر جنگ کرنے کے قابل ہی نہ رہے گا اور دونوں صورتوں میں توران کو یہ فائدہ ہوگا کہ ایران پر قبضہ جما لے۔ یہ سازش اتنی خوب صورتی سے کی گئی کہ اپنے طے شدہ انجام کو پہنچی۔

سہراب کو اپنی ماں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اس کا باپ رستم ہے۔ وہ اپنے باپ سے ملنے کی آرزو میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ شاہِ توران نے اپنے کچھ سردار اور فوج اس کے ساتھ کر دی مگر انھیں تاکید کر دی کہ کسی طرح باپ بیٹے ایک دوسرے کو جاننے نہ پائیں، بلکہ آپس میں لڑ جائیں۔ آخر کار ایک موقع پر رستم اور سہراب کا آمنا سامنا ہوا۔ سہراب کو شبہ ہو گیا کہ یہی رستم ہے۔ مگر رستم نے بعض مصلحتوں کے تحت رستم ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے بھی کوئی نوعمر اور ناتجربہ کار تورانی سردار سمجھا (کیوں کہ اسے تو یہ معلوم تھا کہ اس کا اپنا کوئی بیٹا نہیں ہے)۔ پہلے دن کے مقابلے میں سہراب نے رستم کو زیر کر لیا۔ پھر ایک بہادر کی طرح اسے زندہ چھوڑ دیا کہ اگلے دن آ کر لڑ لینا۔ رستم کو اپنی یہ شکست نہایت شاق گزری اس کے بعد کہانی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو نصاب میں شامل ہے۔

نصابی حصے کا خلاصہ: رستم اور سہراب کے درمیان نصاب میں شامل ڈرامے کا ٹکڑا رستم کی دعا سے شروع ہوتا ہے جسے ایک دن پہلے سہراب کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ رات بھر خدا کے آگے گڑگڑا کر دعا کرتا ہے کہ اس کی جوانی کی طاقت اسے پھر مل جائے۔ ورنہ اسے سخت شرمندگی رہے گی کہ وہ جس نے اس سے پہلے کبھی شکست نہ کھائی تھی ایک ناتجربہ کار لڑکے سے ہار گیا۔ صبح ہونے پر ایک بار پھر وہ آمنے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ سہراب بوڑھے رستم سے جنگ کرنے سے گریزاں ہے۔ مدِ مقابل کی ہمت اور جوش دیکھ کر سہراب کو اس شخص پہ رستم کا گمان ہوتا ہے۔ مگر رستم آن کی آن میں سہراب پر غالب آ جاتا ہے اور فوراً ہی مہلک وار لگا کر اسے زخمی کر

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

دیتا ہے۔موت کی تکلیف بھلا کر سہراب اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ وہ رستم سے کہتا ہے کہ کہیں دور جا کر چھپ جا، کیوں کہ تو میرے باپ رستم کے انتقام سے نہ بچ سکے گا۔ رستم حیران ہو کر جواب دیتا ہے کہ اس کے تو کوئی بیٹا ہی نہیں ہے۔ سہراب اپنے بازو پر بندھے ہوئے تعویذ کی طرف رستم کی توجہ دلاتا ہے۔ اس انکشاف سے رستم کو یقین ہو جاتا ہے کہ زخمی بہادر اس کا اپنا بیٹا ہے۔ اس حقیقت کا علم ہونے پر رستم کی جو حالت ہوئی اس کا اظہار ڈراما نگار نے بہت زوردار اور بھرپور الفاظ میں کیا ہے۔ رستم اپنے کیے پر سخت پشیمان ہوتا ہے۔ سہراب قسمت کا فیصلہ سمجھ کر موت کو گلے لگاتا ہے۔ سامنے پڑی لاش دیکھ کر رستم ٹوٹے دل سے رب کے حضور گریہ وزاری کرنے لگتا ہے۔ مگر جانے والے لوٹ کے کہاں آتے ہیں۔ وہ "سہراب۔ سہراب" پکارتے پکارتے بے ہوش ہو جاتا ہے۔

مشق

سوال نمبرا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) **رستم نے خدا کے حضور کیا دعا کی تھی اور اس دعا کا کیا انجام ہوا؟**

(جواب) رستم نے خدا سے اپنے لیے جوانی کی طاقت مانگی تھی تاکہ دشمن کو زیر کر سکے۔ یہ دعا اس کے حق میں قبول ہوئی مگر انجام دردناک ثابت ہوا۔ رستم کے ہاتھوں مارا جانے والا اس کا بیٹا سہراب تھا۔

(ب) **سہراب نے رستم کو کیا پیش کش کی اور رستم نے اس پیش کا کیا جواب دیا؟**

(جواب) نوجوان سہراب نے رستم کی جاں بخشی کی پیشکش کی۔ لیکن بوڑھے شیر دل رستم نے اس کی پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ ضروری نہیں کہ ہر بار مجھے ہی شکست ہو۔ قسمت کا فیصلہ تمہارے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔

(ج) **یہ جاننے کے بعد سہراب، رستم ہی کا بیٹا ہے، رستم کی کیا کیفیت ہوئی؟**

(جواب) رستم کے ہاتھوں سہراب کا کام تمام ہونے کے بعد جب معلوم ہوا کہ سہراب رستم کا بیٹا ہے تو وہ سخت نادم ہوا۔ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ اپنی شقی القلبی پر اسے اس قدر شرمندگی تھی کہ خود کو حیوان سے بھی زیادہ بدتر خیال کرتا تھا۔

(د) **سہراب اپنے مقابل یعنی رستم کی موت کیوں نہیں چاہتا تھا؟**

(جواب) سہراب کا بوڑھے رستم سے سامنا تھا جس کے بارے میں مکمل یقین نہ تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ البتہ کچھ غیبی اشارے اور دل کی پکار سہراب کو دشمن سے لڑنے سے روک رہے تھے۔

(ہ) **سہراب کی موت پر رستم کے جذبات اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔**

(جواب) میرے لختِ جگر! یوں منہ پھیر کے جانے والے! غم و آلام کی دلدل میں دھنستا چھوڑ کر، عمر بھر کی تنہائیاں دان کر کے، کلیجے کو چھلنی کر کے کہاں چلے! زندگی ایسی سزا بن جائے گی معلوم نہ تھا۔ ایسی کشتی کا کیا کروں جس کا ناخدا ہے نہ کوئی کنارا ہے، جسے موج و طوفان نے آ گھیرا ہے۔ اس نیلگوں چھت کے نیچے اس دھرتی پر بلکہ پوری کائنات میں مجھ سا بھی سیاہ بخت کوئی ہوگا! اے کاتبِ تقدیر! بیٹے کی قربت مجھے کیوں نہ راس آ سکی۔ میرا مرکزِ محبت، میری زندگی کا آسرا، میرے قلب و نظر کا مدعا مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیوں دور ہو گیا۔ سحر ہونے سے پہلے چراغِ امید بجھ چکا ہے۔ نگاہوں میں چار سو

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ویرانیاں ہیں۔ معمورۂ بستی میں مجھے کوئی نظارہ کیوں کر بھائے گا۔ اے بہارو! اگر ہمدرد ہو تو میرے دل کو زخمی چھوڑ دو۔ اے فلک! تجھ میں ذرا رحم ہے تو میری آنکھوں سے لہو بہنے دے، مجھے تڑپنے دے۔ میں ابدی غم کا قیدی ہوں، مجھ پہ ترس کھا۔ اے دنیا! تو ایک سراب ہے۔ پانی مل جائے تو پیاسا رکھتی ہے۔ ہم پر حقارت کی نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ تو اس دن سے ڈر جب میری آہیں تیز آندھیوں کا روپ دھار لیں اور میرے آنسو سیلاب بن کے تیرا نشان مٹا دیں۔

سوال نمبر ۲: ذیل کے الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ و تراکیب	جملے
سجدہ ہائے نیاز	آزمائش کی گھڑی میں نیکوکاروں کے سجدہ ہائے نیاز اور دعاؤں نے قوم کی عزت رکھ لی۔
قہر و غضب	ان بستیوں کا نام و نشان بھی نہیں رہا جن پر نافرمانیوں کے سبب رب تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوا۔
چراغ بجھانا	بیٹے کی زندگی کا چراغ بجھا تو ماں باپ غم کی تصویر بن کے رہ گئے۔
موذی	سڑک کے اُس پار کبھی کبھار کوئی موذی جانور آ نکلتا ہے۔
محبت و عاجزی	شاگرد کی محبت و عاجزی دیکھ کر استاد کا چہرہ کھل اٹھا۔
گُلِ شاداب	ہر چیز کو فنا ہے۔ آج جس گلِ شاداب کو ہم دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، کل اسے سوکھی پتیوں میں بدل جانا ہے۔

سوال نمبر ۳: مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح بہ حوالۂ سیاق و سباق کیجیے۔

"اولاد باپ کی زندگانی کا سرمایہ اور ماں کی روح کی دولت ہے۔ یہ دولت محتاجوں سے نہ چھین۔"

حوالۂ سیاق و سباق: مذکورہ بالا عبارت آغا حشر کاشمیری کے ڈرامہ "رستم و سہراب" سے لی گئی ہے۔ رستم اور سہراب کے درمیان ہونے والی جنگ میں رستم سہراب پر غالب آجاتا ہے۔ مرتے وقت سہراب کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سے رستم کو پتہ چلتا ہے کہ سہراب اس کا بیٹا ہے۔ یہ جان کر اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔

تشریح: رستم سخت پشیمانی کے عالم میں ہے۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ شامتِ اعمال سے ایک ایسا دردناک حادثہ رونما ہوگا کہ باپ کی محبت کے ہاتھوں مجبور بیٹا لاعلمی میں خود باپ سے جنگ کرے اور اُسی کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔ یہ اولاد ہی تو ہے جسے دیکھ کر ماں باپ جیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا اثاثہ ہوتی ہے تو اولاد۔ جینے کی وجہ ہوتی ہے تو اولاد کی خوشیاں۔ اپنے اثاثہ کی حفاظت کے لیے ماں باپ کیا کچھ نہیں کرتے۔ اپنے سکون کو غارت کر دیتے ہیں۔ صبر و امتحان کی کڑی منزلوں سے گزرتے ہیں۔ ہر دکھ اور درد کو گوارا کر لیتے ہیں۔ رستم رنج و ندامت کے ملے جذبات کے ساتھ رب کے حضور فریاد کر رہا ہے کہ ہمارے سرمایۂ زیست، ہماری روح کے چین سے ہمیں محروم نہ کر۔ تو قادرِ مطلق ہے، ہم مجبور بندے ہیں۔ تو با اختیار ہے، ہم بے بس ہیں۔ ہماری بے بسی پہ رحم فرما۔ میرا کل سرمایہ میری آنکھوں کے سامنے موت کی آغوش میں چلا جائے، یہ دیکھنے کی ان آنکھوں کو تاب نہیں ہے۔ غم کا پہاڑ سہنے کی دل کو طاقت نہیں ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سوال نمبر ۴: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) رستم، سہراب کا تھا:

(الف) چچا　(ب) باپ ✓　(ج) ماموں　(د) دادا

(۲) سہراب رستم سے بار بار پوچھ رہا تھا:

(الف) اس کا گاؤں　(ب) اس کا قبیلہ　(ج) اس کا نام ✓　(د) اس کی ذات

(۳) رستم نے اللہ سے دعا میں اپنے لیے مانگا تھا:

(الف) غلبہ ✓　(ب) مالِ غنیمت　(ج) جوانی کا زور　(د) جیون

(۴) رستم اور سہراب کا تعلق ہے:

(الف) ایران سے ✓　(ب) ہندوستان سے　(ج) عرب سے　(د) افغانستان سے

(۵) ہر نیا دن انسان کے لیے لے کر آتا ہے:

(الف) نئی امید　(ب) نئے لوگ　(ج) نیا موقع　(د) نیا انقلاب ✓

www.downloadclassnotes.com

بیگم کی بلی

امتیاز علی تاج

پیدائش ۱۹۰۰ء۔ وفات ۱۹۷۰ء

مصنف کا تعارف: امتیاز علی تاج اردو ادب میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ اُن کا ڈرامہ "انار کلی" اردو ڈرامے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے یک بابی ڈرامے اپنے دلچسپ اسلوب اور شگفتہ موضوعات کی وجہ سے بے پناہ پسند کیے گئے۔ انار کلی، محاصرہ، غرناطہ، قرطبہ کا قاضی ان کے مشہور تاریخی ڈرامے ہیں۔ تاریخی ڈراموں کے ذریعے امتیاز علی تاج نے جو بلند پایہ تحریریں پیش کی ہیں، ان میں مقصدی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ڈراموں کی ادبیت بھی مسلمہ ہے۔ وہ اپنے اسلوب بیان میں زبردستی بھاری بھر کم الفاظ اور فارسی تراکیب استعمال نہیں کرتے۔ ان کا بیان اور زبان اس قدر مناسب اور رشستہ ہے کہ دلچسپی برقرار رہتی ہے اور پلاٹ بھی قائم رہتا ہے۔ امتیاز علی تاج نے متعدد ریڈیائی ڈرامے بھی تحریر کیے۔ ان کے ریڈیائی ڈرامے ہلکے پھلکے اور قدرے شگفتہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ریڈیائی ڈرامے سماجی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کئی غیر ملکی ڈراموں کے تراجم کیے ہیں۔ ان کے مزاحیہ کردار "چچا چھکن" کو اردو ادب میں لازوال مقبولیت حاصل ہے۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
بحال	خوش و خرم۔ تر و تازہ۔ تن درست	بہ خدا	خدا کی قسم
بھلی مانس	نیک۔ شریف۔ عزت والی	پسیجنا	ترس کھانا۔ رحم کرنا
پھکنی	پائپ کا ٹکڑا جس سے آگ پھونکتے ہیں۔ ہوا پھونکنے کا آلہ	تخمینہ	اندازہ
ٹکا سا جواب	صاف جواب۔ کورا جواب	ٹھکانے لگانا	مار ڈالنا۔ کام تمام کر دینا
خام خیالی	وہم	دل بیٹھنا	دل میں خوشی اور اُمنگ نہ رہنا۔ افسردہ ہونا۔ ہمت ٹوٹنا
دم مارنا	بات کرنا۔ جواب دینا۔ منہ سے اُف نکلنا۔ دخل دینا	راحت	آرام۔ چین۔ سکھ
رختِ سفر باندھنا	سفر کا سامان باندھنا یا تیار کرنا	سبز قدم	منحوس

سر پھرنا	شامت آنا۔ کم بختی آنا۔ عقل نہ رہنا	شغل	تماشا۔ دل لگی۔ کھیل کود
شغل	تماشا۔ دل لگی۔ کھیل کود	عدم کا راستہ	موت کا راستہ
قصاب	حلال کرنے والا	قضا	موت
کام تمام کرنا	خاتمہ کرنا۔ ہلاک کرنا۔ جان لینا۔ مار ڈالنا۔	کوڑی	پیسا۔ پائی۔ (بہت معمولی رقم)
کھکھارنا	کھانسی کی سی آواز نکال کر کسی کو متوجہ کرنا۔ کھانسی کے ذریعے اشارہ کرنا	مبالغہ کرنا	اصل کے خلاف کہنا۔ بڑھا کر بیان کرنا
مجال	حوصلہ۔ طاقت	مسکین	بے چاری۔ عاجز۔ غریب
مسماۃ	مؤنث کی علامت	مشیت ایزدی	اللہ کا حکم۔ اللہ کی مرضی
مضطرب	پریشان۔ بے چین۔ بے آرام۔ بے قرار۔ بے کل	ناقص فہم	ادھوری عقل
نامعقول	ناسمجھ	نذر کرنا	پیش کرنا
ہرچہ بادا باد	جو ہو سو ہو	ہوکیں اٹھنا	درد ہونا۔ صدمہ ہونا

سبق کا تعارف: زیرِ نظر ڈرامے میں ایک عام گھرانے کی کہانی دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ صاحب خانہ اپنی بیگم کی منظورِ نظر پالتو بلی سے عاجز ہیں۔ اس سے چھٹکارے کی تدبیریں کرتے ہیں مگر قسمت کو یہ منظور نہیں ہوتا۔ وہ اس شعر کا مصداق بن کے رہ جاتے ہیں کہ:

قسمت میں جو لکھا تھا، سو دیکھا ہے اب تلک   اور آگے دیکھیے، ابھی کیا کیا ہیں دیکھتے

خلاصہ: صاحبِ خانہ کی بیگم نے ایک بلی پال رکھی ہے۔ وہ انھیں بے حد عزیز اور ان کی توجہ کا مرکز ہے۔ لاڈلی بلی گھر میں آزادانہ گھومتی پھرتی ہے۔ بلی کی اجارہ داری سے تنگ شوہر جو ایک مصنف بھی ہے یکسوئی اور سکون چاہتا ہے۔ اس سے قبل انھوں نے بلی سے نجات کی کئی کوششیں کر رکھی تھیں، مگر ناکام رہے تھے۔ ایک دن انھوں نے اُسے کوئلوں کی کوٹھری میں بند کر دیا۔ خدا کی شان کہ اسی اثنا میں ایک شخص ملازمت کے لیے آ گیا۔ شوہر نے اُس کا معاوضہ طے کر کے یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ بلی کو ٹھکانے لگا کر آ جائے، تاکہ خس کم جہاں پاک ہو۔ ملازمت کا امیدوار بھی مگر ایک چرب زبان تھا۔ پانچ روپے سے کم پر راضی نہ ہوتا تھا۔ خیر کسی طرح معاملہ طے پا کر وہ بلی کو دابے "مہم" پر روانہ ہو گیا۔ بلی کو غائب پا کر بیگم صاحبہ کو تشویش لاحق ہو گئی۔ شوہر نے انھیں بتایا کہ بلی سڑک پر حادثے کا شکار ہو گئی۔ غم نہ کرو، جو ہوا سو ہوا۔ وہ ان کی دلجوئی کی خاطر انھیں ایک بھاری رقم تھما کر شاپنگ کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ صاحبِ خانہ کی گفتگو کے دوران ان کا بھائی بھی گھر میں داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ شوہر اُسے بلی سے پہنچنے والی ایک ایک اذیت کو تفصیل سے بتاتا ہے کہ کس طرح اس کم بخت سے وہ اور محلے والے پریشان تھے۔ گھر گندا رہتا سو رہتا تھا، بیگم تھیں کہ اس کے ناز نخرے اٹھائے جاتی تھیں۔ بیگم سے

تعلقات الگ کشیدہ رہتے تھے۔ پھر ان سب مسائل کا حل نکل آیا اور بالآخر بلی سے جان چھڑا ہی لی۔ ابھی وہ یہ گفتگو کر ہی رہے ہوتے ہیں کہ ان کی بیگم خوش خوش گھر میں داخل ہو کر خوش خبری سناتی ہیں کہ انھیں ہو بہو اُس ''مرحوم و مغفور'' بلی جیسی ایک اور بلی مل گئی ہے۔ نیز انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جس سے انھوں نے یہ بلی خریدی ہے، ضرورت مند معلوم ہوتا تھا، اسے گھر میں ملازمت کے لیے بھی رکھ لیا ہے۔ ملازمت کے لیے رکھا آدمی وہی شخص نکلتا ہے جسے میاں صاحب نے بلی کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری دی تھی۔ اس شخص نے چالا کی سے میاں اور بیوی سے پیسے لے کر نہ صرف اپنا الو سیدھا کیا، بلکہ ملازمت بھی حاصل کر لی۔ میاں صاحب یہ صورتحال دیکھ کر حیرت اور بے بسی کی تصویر بن کے رہ جاتے ہیں اور بیگم حسبِ سابق بلی کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہیں۔

مشق

سوال نمبر ا: **درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:**

(الف) **بلی کا رنگ سیاہ کیسے ہوا؟**

(جواب) بلی کا رنگ کوئلوں کی کوٹھری میں رکھنے سے سیاہ ہوا۔

(ب) **امیدوار نے بیگم کی بلی کو ٹھکانے لگانے کے لیے کتنی رقم طلب کی؟**

(جواب) امیدوار نے بلی کو ٹھکانے لگانے کا معاوضہ پانچ روپے طلب کیا۔

(ج) **میاں بلی سے کیوں بے زار تھا؟**

(جواب) میاں کی بلی سے بے زاری کی کئی وجوہات تھیں۔ بلی بیگم صاحبہ کی منظورِ نظر تھی۔ بیگم اس کی خاطر مدارات میں لگی رہتیں اور شوہر کو توجہ نہیں دے پاتی تھیں۔ بلی صاحبہ اپنے لاڈلے پن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر میں خوب گند بلا کرتیں۔ وہ چیزوں کو نقصان پہنچاتی، گھر کا سکون اور محلے والوں کا آرام غارت کر کے رکھتی تھی۔

(د) **میاں نے بیگم کو خریداری کے لیے کیوں بھیجا؟**

(جواب) بیگم کو بلی کے مرنے کا بے حد افسوس تھا۔ میاں نے ان کی تالیفِ قلب کے لیے انھیں خریداری کے لیے روانہ کیا۔

(ہ) **بیگم نے خریداری کی رقم کا کیا کیا؟**

(جواب) بیگم نے خریداری کی رقم سے بلی خریدی جو ان کے خیال میں بالکل ان کی مردہ بلی سے مشابہ تھی۔

سوال نمبر ۲: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) میاں کو گھر کے لیے ضرورت تھی:

(الف) ڈرائیور کی ~~(ب)~~ (ب) باورچی کی ✓ (ج) مالی کی (د) چوکیدار کی

(۲) میاں نے بلی کو بند کر دیا تھا:

(الف) کمرے میں (ب) باورچی خانے میں (ج) **کوئلوں کی کوٹھری میں** ✓ (د) غسل خانے میں

(۳) میاں نے بلی کو ٹھکانے لگانے کے لیے انعام مقرر کیا تھا:

(الف) اٹھنی ✓ (ب) ایک روپا (ج) دو روپے (د) تین روپے

(۴) میاں نے بیگم کو خریداری کے لیے دیے:

(الف) پانچ روپے (ب) دس روپے ✓ (ج) پندرہ روپے (د) بیس روپے

(۵) بلی تو ہو رہی تھی:

(الف) لال سُرخ (ب) کالی سیاہ ✓ (ج) نیلی پیلی (د) لال گلابی

سوال نمبر ۳: ذیل کے الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ و تراکیب	جملے
خام خیالی	یہ محض ایک خام خیالی ہے کہ دنیا کا ہر شخص سچا اور قابلِ اعتماد ہے۔
دم مارنا	کس کی مجال تھی کہ بادشاہ سلامت کے سامنے دم مار سکے۔
مبالغہ آرائی	صحافت میں مبالغہ آرائی عام ہو چلی ہے۔
رختِ سفر	وہ رختِ سفر باندھ کر روانہ ہونے ہی والے تھے کہ زوردار دھماکوں نے قدم روک لیے۔
مشیتِ ایزدی	انسان ایک حد تک کوشش کر سکتا ہے، مگر یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ مشیت ایزدی کے سامنے سب بے بس ہیں۔
کشیدہ	کشمیر کے مسئلے پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تعلقات ہمیشہ سے کشیدہ رہے ہیں۔

سوال نمبر ۴: آپ کو اس ڈرامے کا کون سا کردار پسند آیا، پسندیدگی کی وجہ بیان کیجیے۔

(جواب) اس ڈرامے میں مجھے صاحبِ خانہ کے کردار نے متاثر کیا۔ وہ اگرچہ بلی کی موجودگی سے اچھے خاصے کبیدہ خاطر ہیں، لیکن کسی موقع پر بھی ان کے رویے میں جارحیت کا عنصر نہیں آپاتا۔ ایک افسانہ نگار ہونے کے ناطے ان کی طبیعت کی حساسیت ڈرامے میں جگہ جگہ محسوس کی جاسکتی ہے۔ بلی کی ایذا رسانیوں پر ان کا مثالی صبر اور انتقامی کارروائی سے پرہیز، بیگم کی تالیفِ قلب، اہلِ محلہ کا احساس، بیگم کی توجہ پانے کے لیے مناسب تدابیر، گھر کی فضا میں ملائمت رکھنے کی کاوش؛ یہ وہ باتیں ہیں جن سے صاحب خانہ کا مثبت رویہ ابھرتا ہے جو انھیں دیگر کرداروں کی بہ نسبت ممتاز کرتا ہے۔

سوال نمبر ۵: اس سبق کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

(جواب) خلاصہ پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۶: مندرجہ ذیل اقتباسات کی تشریح بہ حوالہ متن کیجیے:

(الف) "بہ خدا جب سے وہ سبز قدم گھر میں آئی تھی تمھاری بھابی کے لیے میں تو جیسے کوئی شے ہی نہیں رہا تھا۔"

(جواب) حوالہ متن: مذکورہ بالا اقتباس امتیاز علی تاج کے تحریر کردہ ڈرامہ "بیگم کی بلی" سے لیا گیا ہے۔

www.downloadclassnotes.com

تشریح: اس ڈرامے میں صاحبِ خانہ ایک ادیب ہیں۔ طبیعت کی حساسیت کی بنا پر گھر کی پالتو بلی سے شدید نالاں ہیں۔ ان کی بیگم کا بلی سے بڑھا ہوا لگاؤ انھیں بے چین کیے ہوئے ہے۔ اکثر بلی سے نجات کی تدبیریں بھی سوچا کرتے ہیں۔ اپنی دانست میں ایسی ہی ایک کارگر تدبیر انجام دینے کے بعد وہ اپنے بھائی سے بلی کی ستم ظریفیوں کا حال بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ بلی کا وجود اس گھر میں کئی مسائل کا موجب بنا ہوا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانوں کی ہی اہمیت کم ہوگئی تھی۔ جس کی سب سے بڑی مثال بیگم صاحبہ کے مجازی خدا (یعنی صاحبِ خانہ) کی ہے کہ اس منحوس بلی کی موجودگی میں انھیں اس قدر نظر انداز کیا گیا کہ انھیں اپنے وجود پر ہی شک پیدا ہو چلا تھا۔

(ب) **"میرا اطمینانِ قلب غارت تھا۔ میرے تعلقات ہم سایوں اور کئی دوسرے لوگوں سے تو کیا خود اپنی بیوی سے کشیدہ ہو گئے تھے۔"**

(جواب) حوالہ متن: مذکورہ بالا اقتباس امتیاز علی تاج کے تحریر کردہ ڈرامہ ''بیگم کی بلی'' سے لیا گیا ہے۔

تشریح: زیرِ نظر پیراگراف میں گھر کے سربراہ اپنے دلی دکھ کا اظہار اپنے بھائی سے کر رہے ہیں۔ ان کی بیگم کی نازوں پلی بلی نے گھر میں وہ وہ طوفان اٹھائے ہوئے تھے جس کا بیگم صاحبہ کے علاوہ اہلِ محلہ سمیت سب کو احساس تھا۔ وہ جگہ جگہ اچھلتی کودتی پھرتی تھی۔ چوہوں پر شب خون مار کے صاحبِ خانہ کے خونِ دل سے لکھے افسانوں کو رنگین کر دیتی تھی۔ گند پھیلاتی تھی سو الگ، پڑوسیوں کے معصوم چوزوں تک کو چٹ کر جاتی تھی۔ جس سے شکایت فطری بات تھی۔ ستم بالائے ستم تو یہ تھا کہ مردود جادوگرنی نے میاں بیوی کے تعلقات میں بھی کھچاؤ پیدا کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ تھیں کہ بدستور اس پر جان دیے ہوئے تھیں۔

سوال نمبر ۷: غلط فقرات کی درستی کیجیے:

غلط فقرات	درست فقرات
(الف) یہ میاں ہے وہ بلی	میاں! یہ ہے وہ بلی
(ب) سینے میں میرے تو دل ہے۔	میرے سینے میں تو دل ہے۔
(ج) سمجھتے تم ہو کر رہا ہوں میں مبالغہ آرائی	تم سمجھتے ہو میں مبالغہ آرائی کر رہا ہوں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

تھر کی نادیہ کمانچی

وہ اولمپک گولڈ میڈل جیت سکتی تھی

مستنصر حسین تارڑ

پیدائش ۱۹۳۹ء

تعارفِ مصنف: مستنصر حسین تارڑ پاکستان کے مشہور سفر نامہ نگار ہیں۔ ان کی وجہ شہرت سفر نامے اور ناول نگاری ہے۔ اس کے علاوہ ڈراما نگاری، افسانہ نگاری اور فنِ اداکاری سے بھی وابستہ رہے۔ مستنصر حسین تارڑ پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب ہیں۔ ٹی وی ڈراموں میں کام اور مختلف پروگرامز میں میزبانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ پی ٹی وی نے جب پہلی مرتبہ ۱۹۸۸ء میں صبح کی نشریات صبح بخیر کے نام سے شروع کیں تو مستنصر حسین تارڑ نے ان نشریات کی کئی سال تک میزبانی کے فرائض سر انجام دیے۔ اخبار جہاں میں ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناول کے حوالے سے بھی وہ ایک اہم نام ہیں۔ انھوں نے "بہاؤ"، "راکھ"، "خس و خاشاک زمانے کے" اور "اے غزال شب" جیسے شہرہ آفاق ناول لکھے۔ ریڈیو پاکستان پر بھی پروگرام کی بھی میزبانی کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۷ء میں انھیں ماسکو، روس میں ہونے والے یوتھ فیسٹول میں جانے کا موقع ملا۔ (اُس سفر کی روداد ۱۹۵۹ء میں ہفت روزہ قندیل میں شایع ہوئی) اس سفر کی روداد پر ناولٹ "فاختہ" لکھا۔ یہ قلمی سفر کا باقاعدہ آغاز تھا۔ ۱۹۶۹ء میں وہ یورپی ممالک کی سیاحت پر روانہ ہوئے، واپسی پر "نکلے تری تلاش میں" کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ یہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ اِس کتاب کو ملنے والی پزیرائی کے بعد انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلا سفر نامہ "اندلس میں اجنبی" تھا۔ ۴۲ برسوں میں ۳۰ سفر نامے شائع ہوئے۔ ۱۲ صرف پاکستان کے شمالی علاقوں کے بارے میں ہیں۔ پاکستان کی بلند ترین چوٹی "کے ٹو" پر ان کا سفر نامہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہفتے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس علاقے سے اُن کے گہرے تعلق کی بنا پر وہاں کی ایک جھیل کو "تارڑ جھیل" کا نام دیا گیا۔ ان کے چند نمایاں سفر ناموں کے نام یہ ہیں۔ "نکلے تری تلاش میں"، "اندلس میں اجنبی"، "خانہ بدوش"، "نانگا پربت"، "نیپال نگری"، "سفر شمال کے"، "سنو لیک"، "کالاش"، "کیلاش داستان"، "ماسکو کی سفید راتیں"، "یاک سرائے"، "نیویارک کے سو رنگ"، "ہیلو ہالینڈ"، "لاہور سے یارقند"، "راکاپوشی نگر"، "اور سندھ بہتا رہا"۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
اپاہج	جو شخص چل پھر نہ سکے	اُمڈ آنا	ہجوم کرنا
ایندھن	جلانے کی لکڑی یا کوئلے وغیرہ	براہِ راست	بلا واسطہ۔ بغیر کسی ذریعے کے
براجمان ہیں	تشریف رکھتے ہیں	آہو	ہرن
بعد ازاں	اُس کے بعد	بے آب و گیاہ	وہ جگہ جہاں نہ پانی نہ سبزہ

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

پھریرا	جھنڈے کا کپڑا	تعین	تقرر
چٹیل	وہ میدان جہاں کوئی سایہ دار درخت نہ ہو	حسب وعدہ	وعدے کے مطابق
حصار	چار دیواری۔ احاطہ	خنک	سرد۔ ٹھنڈی
سالار	سردار۔ کپتان	عجوبہ	عجیب شے۔ انوکھی چیز
کائیاں	چالاک۔ ہوشیار۔ دھوکے باز	کوہ نورد	پہاڑوں میں گھومنے پھرنے والے
قلانچیں بھرنا	چھلانگیں مارنا۔ چوکڑیاں بھرنا	ماس	گوشت
مترجم	ترجمہ کرنے والا	ہزیمت	شکست۔ ہار۔ پس پائی

خلاصہ: مستنصر حسین تارڑ سندھ کی سیاحت کو نکلے تھے۔ ان کا رُخ صحرائے تھر کی طرف تھا۔ ان کے رفیق سفر دیدہ دل نے گاڑی کا رخ کارونجھر کی چٹانوں کی طرف کرلیا۔ چٹانیں دل کش تھیں۔ بلندی پر چڑھ کر بہت سی چٹانوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ حساس دل ہو تو یہاں کی فضا میں گھلی ہوئی اداسی کو محسوس کرسکتا ہے۔ مصنف کی نظر اچانک تین بچوں پر پڑی جو غریب اور محنت کش معلوم ہوتے تھے۔ تھر کی تیز دھوپ نے ان کے جسم جھلسا دیے تھے۔ ان بچوں میں ایک دس برس کی بچی بھی تھی جس کا دعویٰ تھا کہ وہ پانچ منٹ میں کوہ کارونجھر کی آخری چٹان کی بلند ترین سطح کو چھو کر آسکتی ہے۔ انھیں یقین نہ آیا۔ تجسس کے لیے انھوں نے لڑکی کے دعوے کا امتحان لینا چاہا۔ حکم پاتے ہی وہ اچھلتی، کودتی، چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتی بلندی پر پہنچی اور واپس آگئی۔ جس پھرتی سے اس نے چڑھائی کا مرحلہ طے کیا تھا، سفر نامہ نویس اور ان کے رفقا حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مزید برآں حیرت یوں بھی بڑھ گئی کہ بچی پر تھکن کے آثار بھی نہ تھے۔ اس بچی کا نام نادیہ تھا۔ وہ لکڑیاں چننے اور گھاس کاٹنے کا کام کرتی تھی۔ مصنف کو اس کی صلاحیت کی بڑی قدر ہوئی۔ اسے انعام سے نوازا۔ پسماندہ علاقے کی رہنے والی بچی کا ایسا کرتب دیکھ کر مصنف کا ذہن مشہور جمناسٹ نادیہ کمانچی کی طرف چلا گیا۔ تھر کی نادیہ، نادیہ کمانچی سے کسی طور کم نہ تھی۔ اس کے دوڑنے کا انداز نفسیاتی طور پر ایتھوپیا کے اولمپین بکیلا کی طرف لے جاتا تھا۔ جس کا دوڑ کے مقابلہ میں کوئی ثانی نہ تھا۔ کئی اعزازات وہ اپنے نام کر چکا تھا۔ مصنف کا خیال ہے کہ مناسب توجہ اور تربیت سے تھر کی نادیہ بھی پاکستان کی نیک نامی میں اضافہ کرسکتی ہے۔

حوالۂ سبق: یہ اقتباس مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامہ ''تھر کی نادیہ کمانچی'' سے لیا گیا ہے۔

اقتباسات کی تشریح

(۱) ''ہم دیکھ رہے تھے کہ وہ بندریا اب ہم سے اتنی دور ہو چکی ہے کہ ایک چھوٹی سی گلہری لگتی تھی جو چٹانوں پر پھدک رہی تھی۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر اوجھل ہوئی اور کچھ لمحوں بعد چٹانوں کی آخری بلندی پر لہراتے پھریرے کے برابر میں کھڑی ہمیں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں نے گھڑی چیک کی تو پورے تین منٹ۔''

تشریح: مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں کہ وہ صحرائے تھر کے سفر پر تھے۔ ننگر پارکر کے علاقے میں جہاں بہت سے چٹانی سلسلے ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ایک دس سالہ بچی نے بتایا کہ وہ تین منٹ میں کوہ کارونجھر کی بلند ترین سطح کو چھو سکتی ہے۔ بظاہر اس کا یہ دعویٰ ناقابلِ یقین معلوم ہوتا تھا کہ ایک کمزور سی بچی یہ کارنامہ کیسے انجام دے سکتی ہے جسے سوچ کر ہی پیشہ ور کھلاڑیوں کے دانتوں تلے پسینہ آ جائے۔ دعوے کی سچائی پرکھنے کے لیے انھوں نے اس بچی نادیہ کو بلندی پر چڑھنے کو کہا۔ حکم ملنا تھا کہ نادیہ ایک بندریا کی سی پھرتی کے ساتھ ایک چٹان سے دوسری چٹان پھلانگنے لگی۔ وہ مصنف کی نظروں سے دور ہو رہی تھی، مگر اس کی تیزی اور رفتار پر کچھ فرق نہ پڑا تھا۔ چند سیکنڈوں میں وہ اچھلتی کودتی اتنا فاصلہ طے کرنے کے باوجود ایک گلہری کی طرح چست اور حاضر دماغ معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ مقررہ مقام پر پہنچی تو حیرت میں ڈوبے مصنف نے اپنی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ نادیہ نے اپنا دعویٰ درست ثابت کر دیا تھا۔ جی ہاں، وہ پورے تین منٹ میں چٹان کی بلندی تک پہنچ چکی تھی۔

(۲) "جب وہ ننگے پاؤں ایک آہو کی مانند چٹانوں پر قلانچیں بھرتی تھی تو مجھے ایتھوپیا کا ننگے پاؤں والا بکیلا یاد آتا تھا۔ وہ روزانہ اولمپک کی طویل ترین دوڑ مراتھون سے بھی زیادہ فاصلہ طے کرتا تھا۔"

تشریح: تھر کی نادیہ ایک غریب اور محنت کش بچی تھی۔ قدرت نے اس کو وہ پھرتی عطا کی تھی کہ وہ چند منٹوں میں چٹان کی بلند سر کر سکتی تھی۔ اس کے دوڑنے کا منظر دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی چست ہرن سرعت کے ساتھ چوکڑیاں بھر رہا ہو۔ اس کی غربت اس کے حوصلے پر رتی بھر اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ ایسے باہمت لوگوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔ تھر کی نادیہ جیسی ایک مثال اولمپئن بکیلا کی ہے جو ایتھوپیا جیسے پسماندہ ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے جذبہ میں ایسی قوت تھی کہ مراتھون دوڑ کے مقابلوں میں ہمیشہ سرخرو رہتا تھا۔ اس نے بھی اپنے ابتدائی کیریئر میں مشکلات کا سامنا کیا تھا۔ غربت کا عالم یہ تھا کہ وہ دوڑ کے مقابلے میں شریک ہوتا تو اس کے پاؤں میں جوتے تک نہ ہوتے تھے۔

مشق

سوال نمبر ا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) **کارونجھر پہاڑی سلسلہ کس جگہ واقع ہے؟**

(جواب) کارونجھر پہاڑی سلسلہ ننگر پارکر میں واقع ہے۔

(ب) **مصنف نے ننگر پارکر کی منظر کشی کس طرح کی ہے؟**

(جواب) ننگر پارکر کو جاتے ہوئے مصنف مختلف چٹانی سلسلوں سے گزرے۔ یہ چٹانی سلسلے صحراؤں کے درمیان تھے۔ دیکھنے میں خشک اور چٹیل معلوم ہوتے تھے، لیکن ان کے اندر ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے ذخیرے تھے۔ ان چٹانی سلسلوں کو اپنی خوبصورتی اور شکوہ کی وجہ سے مصنف کبھی ایک عجوبہ قرار دیتے ہیں اور کہیں آسمان سے اتری ہوئی مقدس شے سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان چٹانوں کی بلندی پر ایک ایسی ہموار جگہ آ جاتی ہے جہاں کھڑے ہوں تو سبزے اور پانی کے آثار سے محروم بہت سی چٹانیں دکھائی دیتی ہیں۔ مصنف کو یہاں کی ہواؤں میں تیزی اور ایک طرح کا درد محسوس ہوتا ہے۔

(ج) **تھر کی بچی کس بات کا دعویٰ کر رہی تھی؟**

(جواب) تھر میں ملنے والی بچی کا دعویٰ تھا کہ وہ چٹانی سلسلے کی بلند ترین چوٹی کو تین منٹ میں پہنچ کر چھو سکتی ہے اور وہاں سے منٹ میں واپس اسی جگہ آ سکتی ہے۔

(د) **تھر کی نادیہ کماچی کے کردار پر روشنی ڈالیے۔**

(جواب) تھر کی نادیہ کماچی ایک باہمت اور جرأت مند بچی تھی۔ وہ حیرت انگیز طور پر پھرتیلی تھی۔ وہ غریب ضرور تھی، مگر غربت نے اس کے حوصلہ میں رتی برابر رکاوٹ پیدا نہیں کی تھی۔ ناقابلِ یقین حد تک پہنچی ہوئی قابلیت کی بنا پر اُسے عالمی جمناسٹوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا تھا۔

(ہ) **مصنف نے تھر کی بچی کو کس عالمی شہرت یافتہ لڑکی کے مترادف مانا؟ اور کیوں؟**

(جواب) تھر کی بچی ملکی و عالمی توجہ حاصل نہ کر سکی۔ تاہم اس کی صلاحیت کسی عالمی جمناسٹ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مصنف کی آنکھیں اس کی صلاحیتوں کا نظارہ کر چکی تھیں کہ کس طرح وہ پھرتی کے ساتھ اچھلتی کودتی چند منٹوں میں چٹان کی بلندی پر پہنچی۔ اس لیے وہ بلا جھجک اسے رومانیہ کی عالمی شہرت یافتہ جمناسٹ نادیہ کماچی کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ ان دونوں میں بس فرق اتنا تھا کہ تھر کی نادیہ ایک پسماندہ علاقے سے تعلق رکھتی تھی۔ جبکہ رومانیہ کی نادیہ کماچی کو وہ وسائل میسر تھے جس کی بنا پر وہ عالمی سطح پر ایک جمناسٹ کی حیثیت سے ابھری اور نام پیدا کیا۔

(و) **ایتھوپیا کے کس شخص کا مصنف نے ذکر کیا ہے؟ اور کیوں؟**

(جواب) مصنف نے ایتھوپیا سے تعلق رکھنے والے بکیلا کا ذکر کیا ہے۔ تھر کی نادیہ کے چٹان کی بلندی پر پہنچنے کا احوال بیان کرتے ہوئے انھیں بکیلا یاد آ گیا۔ بکیلا ایک اولمپین تھا۔ وہ مراتھون دوڑ میں ننگے پاؤں اس پھرتی کے ساتھ دوڑتا تھا کہ مقابلے میں شریک کئی کھلاڑیوں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتا تھا۔ تھر کی نادیہ کی ظاہری حالت اور فنی مہارت بکیلا سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ مصنف کا خیال ہے کہ جس طرح مناسب ٹریننگ سے بکیلا نے شہرت کمائی، اسی طرح نادیہ جیسے بچوں کے فن کی سرپرستی کی جائے تو یہ بھی ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔

(ز) **آپ سندھ کے کسی اور شہر کی روداد سفرنامے کے انداز میں تحریر کیجیے۔**

ننگر پارکر اور اسلام کوٹ کے سفر کی روداد

ہم دوستوں نے پروگرام بنایا کہ تھر کی سیر کی جائے۔ اس سلسلے میں ایک دوست سے رابطہ کیا گیا۔ اُن کی رہائش اسلام کوٹ میں تھی۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ صبح ساڑھے ٦ بجے لیاقت آباد سے مٹھی کے لیے بس نکلتی ہے۔ اس میں سوار ہو جائیں اور مٹھی پہنچ کر مجھ سے رابطہ کریں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ہم بس میں سوار ہو گئے اور مٹھی کے لیے روانہ ہوئے۔ بس شاہراہ فیصل سے ہوتی ہوئی نیشنل ہائی وے سے ٹھٹھہ کی طرف رواں دواں تھی راستے میں ہمیں چوکھنڈی کا قبرستان ملا۔ کراچی میں صبح صبح لوگ اپنے روزگار کے لیے دفاتر اور فیکٹریوں کا رخ کر رہے تھے۔ جب ہم ٹھٹھہ پہنچے تو وہاں مکلی کا قبرستان اپنی تاریخی حیثیت کے ساتھ ہمیں بس سے نظر آ رہا تھا۔ یہ قبرستان تقریباً

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

آٹھ کلومیٹر کے رقبے پر محیط ہے جہاں لاکھوں قبور ہیں۔ یہاں کئی بادشاہ، علما، فضلا، فقہا، محدثین، شعرا، مغل، نواب، فلسفی اور سپہ سالار سپردِ خاک ہیں۔ یہاں کی قبروں کی خاص بات اُن کے دیدہ زیب خدوخال اور نقش و نگار ہیں جو سندھ کی قدیم ثقافت، تہذیب اور ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ٹھٹھہ سے بس اب سجاول کی طرف جارہی ہے۔ ہم سب سجاول پہنچتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے بس رُک جاتی ہے۔ بس کی کھڑکی سے ہمیں گورنمنٹ ڈگری بوائز کالج سجاول کی بلڈنگ نظر آتی ہے۔ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد اب بس دوبارہ روانہ ہوئی تو راستے میں ہمیں بدین ملا۔ اس کے بعد ہم تھر میں داخل ہوگئے۔ بس کی کھڑکی سے جو نظارے ہم کر رہے تھے وہ بہت دلچسپ تھے۔ پکی سڑک پر بس تیزی سے رواں تھی اور دونوں طرف ریگستان تھا۔ کہیں کہیں ہمیں تھر کے مخصوص لباس میں لوگ نظر آئے۔ ساتھ ہی ریگستانی جہاز (اونٹ) بھی اس ریگستان میں جگہ جگہ نظر آئے۔ اونٹوں کے اوپر ڈولی پر نقش و نگار اور بیل بوٹے سجے ہوئے ہیں۔ اونٹ کی لگام بھی خوب صورتی سے گوٹے کنارے سے سجائی گئی ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد اب ہم مٹھی پہنچ گئے ہیں۔ بس سے اُترنے کے بعد ہم نے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد کے وضوخانے سے منہ ہاتھ دھوئے اور اپنے میزبان کو فون کیا۔ انھوں نے کسی سے رابطہ کرکے ہمیں کہا کہ انتظار کریں کچھ دیر میں میرا ایک عزیز آپ کے پاس آجائے گا جو آپ کو اسلام کوٹ لے آئے گا۔ مٹھی سے اسلام کوٹ کا فاصلہ تقریباً ۴۰ کلومیٹر ہے۔ جب وہ صاحب آئے تو ہم کار میں سوار ہوکر اسلام کوٹ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں دونوں طرف جنگل تھا۔ مگر پختہ سڑک پر کار تیزی سے رواں دواں تھی۔ میزبان نے بتایا کہ جب بائیں جانب سڑک مُڑے گی تو چند قدم کے فاصلے پر نیم کے درخت کے سائے میں ہم آپ کے منتظر ہوں گے۔ حسبِ ہدایت ڈرائیور نے ہمیں مطلوبہ جگہ پہنچا دیا، سامنے ہمارے میزبان موجود تھے۔ ہمارے اس میزبان نے اسلام کوٹ جیسے ایک چھوٹے سے غیر معروف شہر میں رہتے ہوئے بھی تقریباً ساڑھے تین ہزار کتابوں کا خزینہ جمع کرلیا ہے۔ مخدوم بلاول لائبریری میں کچھ کتب تو ایسی نادر ہیں جو غالباً کراچی کی بڑی لائبریریوں میں بھی موجود نہیں۔ ہمارے استقبال کرنے کے بعد انھوں نے ہمیں پُرتکلف کھانا کھلایا۔ اس کھانے میں چاول کی روٹی، مرغ کا سالن، میٹھے چاول اور لسی نے ہماری بھوک میں مزید اضافہ کردیا۔ کھانے کے بعد اب یہاں سے مزید آگے ننگر پارکر جانے کا پروگرام بنایا گیا۔ میزبان نے ہی ایک جیپ کا انتظام کیا اور خود بھی ہمارے ساتھ روانہ ہوئے۔ جیپ اب اسلام کوٹ سے ننگر پارکر کی جانب رواں تھی کہ دوڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد ہمیں ایک قدیم جین مت کا مندر دکھائی دیا۔ اس کے بعد ہم مزید آگے گئے تو ماروی کا کنواں دیکھا۔ ساتھ ہی ایک میوزیم بھی تھا جس میں تھر کی ثقافت سے متعلق چیزیں موجود تھیں۔ اب ہم ننگر پارکر کی طرف رواں دواں ہیں اور تقریباً چار ساڑھے چار گھنٹے میں ننگر پارکر میں داخل ہوئے تو مغرب کا وقت ہوچکا تھا۔ ہمیں ہمارے میزبان کے دوستوں نے خوش آمدید کہا۔ پھر انھوں نے ایک چائے خانہ سے بہترین چائے پلائی۔ خالص دودھ کی چائے کا مزہ شہروں میں تو ممکن نہیں۔ ہم چائے کی چُسکیاں لے رہے تھے اور کبھی کبھی سر اُٹھا کر آسمان کی جانب دیکھتے تو پورے آسمان پر ستارے اپنی جگمگاہٹ اور روشنی سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ شہروں میں آلودگی کے سبب آسمان بھی دھوئیں کے بادلوں سے ڈھک چکے ہیں اور ہمیں کہیں بھی قدرت کے وہ حقیقی مناظر نظر نہیں آتے جو ہم نے یہاں دیکھے۔ جس جگہ ہمیں آرام کرنا تھا ہم یہاں سے وہاں گئے۔ اپنا سامان رکھا۔ ہاتھ منہ دھوئے اور پھر دوبارہ کھانے کے لیے ایک ہوٹل گئے جہاں پر دال اور انڈہ فرائی کھایا۔ پھر آرام والی جگہ آئے۔ راستے میں جو دکانیں ہمیں کھلی ملی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

تھیں اب دس بجے رات کو وہ بند ہو چکی تھیں۔گلیاں صاف ستھری تھیں۔راستے بھی کشادہ تھے۔گھروں کے اندر ہی پرانی طرز کی دکانیں بنائی گئی تھیں جن کے دروازے لکڑی کے تھے۔یہ سب بہت سادہ اور اچھے لگ رہے تھے۔ پھر دوستوں نے سونے کا پروگرام بنایا کہ اب بہت تھک چکے ہیں لہٰذا صبح اُٹھ کر ننگر پارکر کی سیر کی جائے۔صبح سویرے ہی تمام دوست اُٹھ گئے تھے۔صبح کا ناشتہ کیا۔اور پھر سب جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ ننگر پارکر کے پہاڑی سلسلے کی جانب روانہ ہوئی۔ایک مقام پر جا کر جیپ رُک گئی اور ہمیں میزبان نے کہا کہ یہاں سے اوپر پیدل ہی جانا ہوگا۔اس وقت ہمیں مستنصر حسین تارڑ کی تھر کی نادیہ کمانچی یاد آگئی کہ وہ کس تیزی سے ان پہاڑوں کو عبور کر کے کبھی اوپر اور کبھی نیچے آتی ہے۔ہم سب تو تھوڑی سی چڑھائی کے بعد ہی تھک گئے تھے۔مگر ہمت کر کے آگے بڑھے۔ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں پہاڑی پر ایک مندر بنا ہوا تھا۔اس کے علاوہ ایک شمشان گھاٹ بھی موجود تھا۔اسی جگہ پر تقریباً سو سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ان سیڑھیوں کے ذریعے آپ ایک بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے پھر تھر کا نظارہ کرتے ہیں۔یہاں پر ہمیں موروں کی بڑی تعداد نظر آئی جو رقص بھی کر رہے تھے۔ہم نے تھوڑا وقت یہاں گزارا اور پھر واپسی کا قصد کیا۔راستے میں بازار سے ہم نے ایک خاص قسم کی مٹھائی خریدی جو یہاں کی سوغات تھی۔پھر دوبارہ اسلام کوٹ آئے اور دوپہر کا کھانا کھایا۔وہاں سے دوبارہ جیپ کے ذریعے ہی ہم مٹھی پہنچے۔مٹھی پہنچتے ہی ہمیں مطلوبہ بس میں جگہ مل گئی اور ہم کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔یہ سفر ایک یادگار سفر تھا جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔

سوال نمبر ۲: اس سبق میں کتنے محاورے استعمال ہوئے ہیں؟ آپ ان میں سے کوئی بھی تین اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔

(جواب) اس سبق میں کل چھ محاورے استعمال ہوئے ہیں۔سسکیاں بھرنا، کمر کسنا، سانس چڑھنا، قلانچیں بھرنا، حیرت میں ڈوبنا، انعام واکرام کی بارش ہونا۔

محاوروں کا جملوں میں استعمال:

محاورے	جملے
سسکیاں بھرنا	جب کبھی اسکے سامنے مرحوم والد کا ذکر ہوتا، وہ سسکیاں بھرنے لگتی تھی۔
کمر کس لینا	فائنل مقابلے میں جان کی بازی لگانے کے لیے کھلاڑیوں نے کمر کس لی ہے۔
انعام واکرام کی بارش ہونا	اپنی جان پر کھیل کے بچوں کی جان بچانے والے پولیس اہلکار پر ہر طرف سے انعام واکرام کی بارش ہونے لگی

سوال نمبر ۳: اس سبق کا مرکزی خیال اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(جواب) پاکستانی قوم صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔شہروں کا تو ذکر کیا، صحرائی علاقوں میں رہنے والے نوعمر بچے بھی ایسی حیرت انگیز صلاحیتوں سے مالا مال ہیں کہ عالمی سطح پر اپنے فن کا لوہا منوا کر وطنِ عزیز کا نام روشن کر سکتے ہیں۔ٹیلنٹ کسی کی میراث نہیں ہوا کرتا۔ضرورت ہے کہ ایسے گوہر نایاب تلاش کرنے کی فکر کی جائے قبل اس کے کہ ان کا فن روزی کی بھٹی کا ایندھن بن جائے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سوال نمبر ۴: اس سبق میں کتنے ملکوں، شہروں اور جگہوں کا ذکر کیا گیا ہے؟ اور کیوں؟

(جواب) اس سبق میں چار ملکوں آسٹریلیا، رومانیہ، ایتھوپیا، پاکستان کا ذکر آیا ہے۔ شہروں میں روم، تھر، ننگر پارکر کے نام آئے ہیں۔ جب کہ جگہوں میں صحرائے تھر، کارونجھر، آسٹریلیا کی الورو چٹان کا ذکر کیا گیا ہے۔ منظر کو قارئین کی نفسیات سے قریب کرنے کے لیے سفرنامہ نگار نے شہروں، ملکوں اور جگہوں کا ذکر اس سفرنامے میں کیا ہے۔ کہیں بطور حوالہ اور کہیں مثالاً۔

سوال نمبر ۵: ذیل کے الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

(جواب)

الفاظ	جملے
حسب وعدہ	حسبِ وعدہ آپ کے معاوضے کا چیک ارسال کیا جا رہا ہے۔
بے آب وگیاہ	حضرت ابراہیمؑ کو جس بے آب و گیاہ بستی تشریف لے جانے کا حکم ہوا وہ بعد ازاں مکہ مکرمہ کے نام سے مشہور ہوئی۔
عجوبہ	مجسمہ اس خوبصورتی سے تراشا گیا تھا کہ دیکھنے والے اسے عجوبہ روزگار قرار دیتے تھے۔
کائیاں	ایسے کائیاں شخص کو قابو کرنا آسان نہ ہوگا۔
عبور کرنا	دریا کی طغیانی دیکھ کر اسے عبور کرنے کا ارادہ مؤخر کرنا پڑا۔
چٹیل	چٹیل میدان پر چھٹکی ہوئی چاندنی دلفریب منظر پیش کر رہی تھی۔

سوال نمبر ۶: مرکب مصادر کی چند مثالیں تلاش کیجیے۔

مرکب مصادر: نمودار ہونا، کوشش کرنا، حاصل کرنا، سدھر جانا، دفنانا، مرجانا، بسر کرنا، بر آنا، یاد آنا، بھول جانا، نفع ہونا، تراش خراش کرنا، حاضر ہونا۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ملکہ بلقیس کا محل

قمر علی عباسی

پیدائش ۱۹۳۸ء۔وفات ۲۰۱۳ء

تعارف مصنف: قمر علی عباسی کی ولادت امروہہ ریاست اتر پردیش میں ہوئی ۔ بعدازاں ہجرت کر کے ان کے خاندان نے حیدرآباد سندھ میں سکونت اختیار کی ۔ بی ۔اے آنرز، ایم ۔اے معاشیات ۔ ایم ۔اے اردو کی اسناد سندھ یونیورسٹی جامشورو سے حاصل کیں ۔قمر علی عباسی نے عملی زندگی کا آغاز متروکہ وقف املاک بورڈ، حکومت پاکستان سے کیا۔ کچھ عرصہ بعد نیشنل کالج کراچی میں معاشیات کے لیکچرار ہوئے ۔

یوں تو قمر علی عباسی نے اردو زبان میں بچوں کے لیے کہانیاں اور ناول بھی لکھے ۔لیکن ان کی پہچان سفرنامہ نویس کی حیثیت سے ہوئی ۔قمر علی عباسی سفرنامہ نگار کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے ہیں ۔ ان کے سفرناموں کا اسلوب رواں، شستہ اور شگفتہ ہے ۔ وہ واقعات کو صاف، نتھرے اسلوب میں محاکات کے ساتھ پیش کرتے ہیں ۔ قاری ان کی تحریروں سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور اسے منفرد معلومات اور معاشرتی وسماجی سرگرمیوں کا احوال بھی پڑھنے کو مل جاتا ہے ۔ چاہے قاری نے اس سرزمین کا سفر کیا ہو یا نہ کیا ہو وہ عمومی طرز معاشرت، تہذیب وتمدن سے آگاہ ہو جاتا ہے ۔قمر علی عباسی کی حسِ ظرافت عمومی واقعات کو بھی خاص بنا دیتی ہے ۔"لندن لندن" ان کا پہلا سفرنامہ ہے ۔اس کے علاوہ بغداد زندہ باد، کینیڈا انتظار میں، شام تجھے سلام، دلی دور ہے، شونار بنگلہ، ہندوستان ہمارا، چلا مسافر سنگاپور، لا پیرس، قرطبہ قرطبہ، جاناں سوئٹزرلینڈ، امریکا مت جائیو، برطانیہ چلیں، عمان کے مہمان اور دوسرے بہت سے سفرناموں کو عوام میں مقبولیت حاصل ہے ۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
آب دار	چمک دار	آگہی	آگاہی ۔خبر
باقیات	بچی ہوئی چیزیں ۔ یادگاریں ۔ آثار قدیمہ	بانکے	خوش نما ۔حسین
بلقیس	حضرت سلیمان کے زمانے میں ملک سبا کی ملکہ	پوشاک	لباس
جواہرات	جوہر کی جمع الجمع ۔قیمتی پتھر	دختر زاجیل	زاجیل کی بیٹی

زربفت	ایک کپڑا جو سونے اور ریشم کے تاروں سے بنتے ہیں	زمرد	ہرے رنگ کا ایک قیمتی پتھر
سبا	حضرت سلیمان کے زمانے میں عرب کا ایک ملک	قصر	محل۔حویلی
لعل	ایک قیمتی پتھر	لوبان	ایک درخت سے حاصل ہونے والا گوند جو آگ پر رکھنے سے خوشبو دیتا ہے
محوخواب تھی	سوئی ہوئی تھی	مرصع	جس میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہوں
مزین	سجا سجایا۔سجایا ہوا۔سنوارا ہوا۔زینت دیا ہوا	نشان دہی	پتا بتانا۔ٹھکانا بتانا
ہُدہُد	ایک پرندہ جس کے سر پر تاج یا چوٹی ہوتی ہے	یاقوت	ایک قسم کا قیمتی پتھر

مرکزی خیال: دنیاوی ساز وسامان اور ظاہری شان وشوکت عارضی شے ہیں۔کوئی طاقت نہیں جو رب کی طاقت کے سامنے ٹھہر سکے۔ اب یہ آدمی کا اپنا انتخاب ہے کہ وہ عارضی کامیابی کو کل کائنات سمجھتا ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی کو اختیار کرتا ہے۔اس قصے سے پیغام ملتا ہے کہ ہمیں ہر حال میں خدائی پیغام کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔اسی میں انسانی فلاح اور کامیابی پوشیدہ ہے۔

خلاصہ: حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ہُدہُد غائب پایا گیا۔جب ہُدہُد حاضرِ خدمت ہوا تو اس نے حضرت سلیمان کو شہر سبا کے بارے میں بتایا۔شہر سبا کی ملکہ کی شان وشوکت اس کے دربار کا حال، اس کا حسن اور ذہانت، الغرض اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا پورا احوال گوش گزار کر دیا۔اس نے ملکہ کا دین سورج پرستی بتایا۔حضرت سلیمانؑ نے ہُدہُد کو اعزاز بخشا اور اس کے ذریعہ ملکہ کو خط بھجوا دیا جس میں دینِ اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ملکہ نے اپنی فراست سے اندازہ لگا لیا کہ دینِ اسلام قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔ورنہ یہ شان وشوکت، تخت و تاج، امن وسکون سب خاک میں مل جائے گا۔ملکہ نے امتحان کی غرض سے قیمتی تحفے روانہ کیے۔حضرت سلیمانؑ نے تحفے قبول کرنے کے بجائے دینِ اسلام کی طرف دعوت پر اصرار کیا۔ملکہ کا دل انھیں سچا پیغمبر مان چکا تھا۔البتہ وہ ان سے معجزے کی خواہاں تھی۔حضرت سلیمانؑ نے ایک جن ☆ کے ذریعے ملکہ کا تخت منگوا لیا۔ملکہ کے لیے ایک ایسا حسین وجمیل شیشے کا محل تعمیر کروایا کہ ملکہ بھی شیشے کے فرش کو پانی سمجھ بیٹھی۔ملکہ نے حضرت سلیمانؑ کا پیش کیا ہوا دین قبول کر لیا۔

☆ نوٹ: بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیاہ ہیں جو آسمانی کتب کے عالم اور اللہ کے اسما اور کلام کی تاثیر سے واقف تھے۔انھوں نے عرض کیا کہ میں چشم زدن میں تخت کو حاضر کر سکتا ہوں۔واللہ اعلم

مشق

سوال نمبر ا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجئے:

(الف) حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ہُد ہُد کیوں غیر حاضر تھا؟

(جواب) حضرت سلیمانؑ کے دربار میں ہُد ہُد اس لیے غیر حاضر تھا کہ وہ شہر سبا گیا ہوا تھا۔

(ب) ہُد ہُد کو کیا تحفہ دیا گیا؟

(جواب) ہد ہد کی فرمائش پر حضرت سلیمان نے اس کے سر پر تاج کا تحفہ دیا۔

(ج) ہُد ہُد نے ملکہ سبا کے محل کی کیا منظر کشی کی؟

(جواب) ہُد ہُد نے ملکہ سبا کے محل کا احوال بتاتے ہوئے کہا کہ ملکہ جس تخت پر جلوہ افروز ہوتی ہے وہ تیس گز کا ہے۔ تخت کے پائے قیمتی جواہرات سے مرصع تھے۔ ملکہ بے حد حسین اور عقلمند ہے جس کی شان و شوکت کا کوئی جواب نہیں۔

(د) ملکہ سبا نے تحفۃً حضرت سلیمانؑ کو کیا کیا اشیا بھجوائیں؟

(جواب) ملکہ سبا نے حضرت سلیمانؑ کو تحفے میں سات سونے چاندی کی اینٹیں اور سات زربفت کے تھان بھجوائے۔

(ہ) حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کے تحفے کیوں قبول نہیں کیے؟

(جواب) حضرت سلیمان چاہتے تھے کہ ملکہ سبا اللہ کا دین قبول کر کے فلاح پا جائے۔ وہ ایک بے دین سے تحفے قبول نہیں کرنا چاہتے تھے۔

(و) جن نے ملکہ سبا سے متعلق کیا معلومات فراہم کی تھیں؟

(جواب) جن نے ملکہ کے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ کم عقل ہے اور اُس کی ماں کا تعلق جنوں کے قبیلے سے ہے۔

سوال نمبر ۲: درج ذیل الفاظ وتراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کیجئے:

الفاظ وتراکیب	جملے
تابع	انسان کی کامیابی اس کے ارادے اور کوشش کے تابع ہوتی ہے۔
حسن و جمال	اُخروی نجات حسن و جمال کے بجائے حسنِ اعمال پر موقوف ہے۔
عقل و فراست	اہل علم کی صحبت، مطالعہ کتب اور زمانے کے تجربات آدمی کی عقل و فراست کو بڑھاتے ہیں۔
آگہی	تعلیم کے جس میدان میں قدم رکھنا ہو، پہلے اس کے بارے میں بنیادی آگہی حاصل کرنی چاہیے۔
مرصع	گائیڈ نے بتایا کہ جواہرات سے مرصع یہ زیورات پانچ ہزار سال پہلے مصر کی شاہی خواتین پہنا کرتی تھیں۔
معجزہ	جن کے دلوں پہ مہر لگ چکی ہو، ان پر کوئی معجزہ اثر نہیں کرسکتا۔
باقیات	چلی کے صحرا میں ڈائنا سور کی ۱۶۰ ملین سال پرانی باقیات دریافت ہوئی ہیں۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سوال نمبر ۳: درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے:

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کو غلط اطلاعات فراہم کیں:
(الف) ہُد ہُد نے (ب) جن نے ✓ (ج) عقاب نے (د) توتے نے

(۲) ہُد ہُد کو زمین سے تلاش کرنے کی صلاحیت حاصل تھی:
(الف) پانی ✓ (ب) سونا (ج) ہیرے (د) آب دار موتی

(۳) حضرت سلیمانؑ نے پَر کاٹنے کا حکم دیا:
(الف) عقاب کے (ب) توتے کے (ج) ہُد ہُد کے (د) گھوڑے کے ✓

(۴) حضرت سلیمانؑ نے فرش بنوایا:
(الف) شیشے کا ✓ (ب) قالین کا (ج) سونے کا (د) پانی کا

(۵) جن سمندر سے نکال لایا:
(الف) گھوڑوں کو ✓ (ب) مرغابیوں کو (ج) مچھلیوں کو (د) پرندوں کو

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

خواہ مخواہ کی لڑائی

شوکت تھانوی

پیدائش ۱۹۰۴ء۔وفات ۱۹۶۳ء

تعارف مصنف: محمد عمر نام اور شوکت تخلص تھا۔ضلع مظفر گڑھ کی تحصیل تھانہ بھون کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔تھانہ بھون کی نسبت سے اپنے تخلص شوکت کے ساتھ تھانوی لکھنے لگے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ثانوی یا اعلیٰ تعلیم کسی اسکول سے حاصل نہیں کی بلکہ حصول علم کے ذوق وشوق نے مطالعہ کی طرف راغب کیا۔مطالعہ کی کثرت اور خداداد صلاحیت نے علم میں اضافہ کیا۔شعروادب سے دلچسپی تھی۔لیکن رفتہ رفتہ لکھنے کا شوق صحافت کی طرف لے گیا۔مختلف اخبارات ورسائل سے وابستہ رہے۔ان میں ہمدم، ہمت اور سرپنچ قابل ذکر ہیں۔ان کی طبیعت میں مزاح کا خاص جوہر تھا۔جسے انھوں نے مضمون نگاری اور کالم نگاری کے ساتھ ساتھ ریڈیو کے لیے بھی استعمال کیا۔سب سے پہلے مزاح نگار کی حیثیت سے شوکت تھانوی کا تعارف "سرپنچ" سے ہوا۔"سودیشی ریل" اور "سودیشی ڈاک" سے ان کی شہرت سب سے زیادہ ہوئی۔قیام پاکستان کے بعد وہ اخبارات میں مزاحیہ کالم اور ریڈیو پر مزاحیہ خاکے لکھتے رہے۔ان کی اہم تصانیف میں چاہ شیطان کی ڈائری، خدانخواستہ، سپنے، بکواس، جوڑتوڑ، بقراط، بیگم صاحبہ، غزالہ، سانچ کو آنچ، بھابی، سسرال، سیلاب تبسم، طوفان تبسم، برقِ تبسم، بحرِ تبسم وغیرہ شامل ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
وجدان آتشیں	اندرونی اکساہٹ۔لڑنے کی خواہش	لپاڈکی	تھپڑ اور گھونسے ہاتھاپائی
دھینگامشتی	ہاتھاپائی	سفید پوش	وضع دار
آپے سے باہر ہونا	قابو سے باہر ہونا۔سنبھالے نہ سنبھلنا	آستین چڑھانا	لڑنے کے لیے تیار ہونا۔لڑائی کے لیے کھڑے ہوجانا
ملمع	دکھاوا۔بناوٹ۔وضع داری	مارکین	دراز قسم کا امریکہ کا بنا ہوا کپڑا
چمکارنا	دلاسا دینا۔پیار کرنا	غم کھانا	برداشت کرنا۔غصہ ضبط کرنا۔درگزر کرنا
ریاض کرنا	مشق۔ایک ہی عمل کو باربار دہرانا تاکہ مہارت حاصل ہو	المکلف الخدمت	خدمت کی تکلیف اٹھانے والا۔خدمت کرنے والا
آمد	بے ارادہ کچھ ہوجانا	آورد	ارادے کے تحت کچھ کرنا

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

چھیڑ پھاڑ کر دینا	کثرت سے دینا۔ بے محنت عطا کرنا	داعی	دعوت دینے والا
ترکی بہ ترکی	برابر کا۔ جیسا سوال ویسا جواب	مبدۂ فیض	جہاں سے فیض ملتا ہو۔ فیض پہنچانے والا
گڑے مردے اکھیڑنا	ماضی کے جھگڑے تازہ کرنا۔ ختم ہوجانے والے تنازعے پھر سے اُٹھانا		

مرکزی خیال: شوکت تھانوی کا یہ مضمون ہمارے معاشرے کے مخصوص مزاج کا آئینہ دار ہے کہ جہاں بہت سا وقت لوگ بلاوجہ کی بحث اور اختلافی گفتگو میں ضائع کر دیتے ہیں جس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اکثر اوقات یہ بحث مباحثہ لڑائی تک جا پہنچتا ہے جس میں لڑنے والوں کے علاوہ دیکھنے والوں کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہ لڑائی کیوں ہو رہی ہے۔ اور اس سارے قصے میں ایک دلچسپ حقیقت یہی ہے کہ بعض لڑائیاں خواہ مخواہ کی لڑائیاں ہوتی ہیں کیوں کہ اگر فریقین کی سمجھ میں ایک دوسرے کی بات آجائے تو لڑائی کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ اب وہ بات جو فریقین ایک دوسرے کو نہیں سمجھا پاتے وہ دیکھنے والے کی سمجھ میں کیسے آسکتی ہے۔

خلاصہ: شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ لوگوں کے درمیان لڑی جانے والی لڑائیاں بالعموم بے بنیاد، بلاوجہ اور بلاسبب ہوتی ہیں۔ بلاوجہ کی لڑائیوں کو مصنف نے "خواہ مخواہ کی لڑائی" کا نام دیا ہے۔ اچانک برپا ہونے والی ایسی لڑائیاں مزے دار ہوتی ہیں۔ اتفاقی طور پر کسی شخص سے کوئی جملہ سرزد ہوجائے اور اس کا ردِعمل دوسری طرف سے بھی ظاہر ہو، تو خدا کا فضل و کرم دیکھنے والوں کے شاملِ حال ہوجاتا ہے۔ لڑنے والے بڑی ایمانداری سے لڑتے ہیں۔ دیکھنے والے کہنے کو تو لڑنے والوں پر "تھوتھو" کرتے ہیں، لیکن حقیقتاً ان کے لیے لڑائی کی یہ صورت ایک نعمت سے کم نہیں۔ یہ لاٹری خوش نصیب لوگوں کے نام کھلتی ہے۔ بعض مرتبہ لڑائی کے دوران ایسا دلچسپ منظر نامہ بھی تشکیل پاجاتا ہے کہ تماشائی حضرات تماشے پہ تبصرہ کرتے ہوئے خواہ مخواہ ایک دوسرے پر اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے لگتے ہیں۔ فقرے بازی، طعنہ زنی، ظاہری وضع قطع کے استہزا سے بات آگے بڑھ کر بیچ بچاؤ کرانے تک نوبت آجاتی ہے۔ کیسے ظالم لوگ ہوتے ہیں بیچ بچاؤ کرانے والے بھی تماشے کا سارا مزہ غارت کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح بے ارادہ شروع ہوئی یہ لڑائی بے نتیجہ ہی انجام پذیر ہوجاتی ہے۔ تماشائیوں کی شوخ روحیں اس نوع کی لڑائیوں پر یوں بھی وجد کرتی ہیں کہ لڑنے والے پورے خلوص اور ایمانداری سے لڑے۔ اس ایمانداری پر پورے نمبر کے وہ حقدار ٹھہرتے ہیں۔ البتہ لڑائی کی ایک دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ لڑنے والوں میں کسی ایک شخص نے پہلے سے ہی لڑنے کی ٹھانی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس کی ذہنی طور پر تیاری بھی آفت سے کم نہیں ہوتی۔ لیکن اس لڑائی کو بالکل بھی مثالی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ بقول شوکت تھانوی ان دونوں میں "آمد اور آورد کا فرق" ہوتا ہے۔ چوں کہ اس دوسری لڑائی میں ایک طرح کا تکلف کارفرما ہے، اس لیے اس کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جس کا ڈر ہوتا ہے۔ کسی ایک فریق کو اپنی غلطی کا احساس ہوجائے تو یہ لڑائی ایک افسوس اور ندامت پر منتج ہوکر "ھل من مزید" کے شائقین کو "سوگوار" کرجاتی ہے۔ شوکت تھانوی نے اس دوسری نوعیت کی لڑائی کو الجھانے سے تعبیر کر کے اس کو کسی کے غصے کا نتیجہ بتایا ہے۔ یعنی دل میں غصہ کسی اور پر تھا، اور سارا نزلہ کسی کمزور پہ گرادیا۔ یوں افسر کی ڈانٹ سے پکنے والا لاوا گھر میں بیوی پر آتش فشاں کی صورت پھوٹ بہتا ہے اور بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

مشق

سوال نمبرا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) خواہ مخواہ کی لڑائی سے مصنف کی کیا مراد ہے؟

(جواب) خواہ مخواہ کی لڑائی سے مراد وہ لڑائی ہے جو بغیر کسی وجہ اور ارادے کے لڑی جائے۔

(ب) لڑائی میں اُلجھنے اور اُلجھانے میں کیا فرق ہے؟

(جواب) ایک لڑائی وہ ہوتی ہے جس کی نوبت ناگہانی طور پر بغیر کسی قصد اور ارادے کے آجاتی ہے۔ مصنف نے اسے "اُلجھنے" سے تعبیر کیا ہے۔ لڑائی کی دوسری قسم "اُلجھ جانا" اس سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس دوسری قسم کی لڑائی میں ارادہ اور پہلے سے منصوبہ بندی کارفرما ہوتی ہے۔

(ج) خواہ مخواہ کی لڑائی کا ہماری شخصیت اور ماحول پر کیا اثر ہوتا ہے؟

(جواب) خواہ مخواہ کی لڑائی میں جو فریق کسی وجہ سے دب جاتا ہے، وہ نفسیاتی طور پر دباؤ میں رہتا ہے۔ وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ کوئی اپنے سے کمزور سامنے آجائے تو اس پر سارا غصہ اتارا جائے۔ اس طرح ذرا سی بات خواہ مخواہ کی لڑائی کے طفیل فسانہ بن کر ماحول کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

(د) خواہ مخواہ کی لڑائی سے دامن چھڑانے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

(جواب) صبر وضبط کا مظاہرہ کر کے اور ردِعمل کی نفسیات سے گریز کر کے خواہ مخواہ کی لڑائی سے بچا جاسکتا ہے۔

سوال نمبر ۲: درج ذیل اقتباسات کی تشریح بہ حوالۂ متن کیجیے۔

(الف) "ڈھائی آنے گز کی مارکین کا پتلون کیا پہن لیا ہے کہ اوقات بھول گئے۔"

(جواب) حوالۂ متن: مندرجہ بالا اقتباس شوکت تھانوی کے مضمون "خواہ مخواہ کی لڑائی" سے لیا گیا ہے۔

تشریح: مصنف کا کہنا ہے کہ خواہ مخواہ کی لڑائی کے لیے کوئی وجہ، کوئی بنیاد درکار نہیں ہوتی ہے۔ اتفاقی طور پر پیدا ہونے والی صورتِ حال سے اس نوع کی لڑائی وجود میں آتی ہے۔ پہلے ایک فریق کی طرف سے کوئی جملہ کسا جاتا ہے۔ اس کا جواب دوسرے شخص پر گویا لازم وملزوم ہوجاتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ چنانچہ کئی طرح کے مسالے اس کے ردِعمل میں شامل ہوجاتے ہیں۔ مدِمقابل کا مذاق اُڑانا، اس کو نیچے دکھانا، اس کی تراش خراش کو مضحکہ خیز بنانا؛ ان سارے "وسائل" کو بروئے کار لا کر جواب میں زور پیدا کیا جاتا ہے۔ کچھ جواب نہ بن پڑے تو سامنے والے کے حلیے اور لباس کو ہی بنیاد بنا کر اپنے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچائی جاتی ہے کہ "لباس اچھا پہن لینے سے طبیعت کا اوچھاپن تو ختم نہیں ہوتا"۔۔۔ وغیرہ۔ مارکین دراصل لم دراز کی قسم کا امریکہ کا بنا ہوا موٹا کورا کپڑا ہوا کرتا تھا۔ یہ اس وقت معروف برانڈ تھا جسے طبقۂ اشرافیہ پہنتا تھا۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(ب) "لڑائی کو احساس اور سمجھ سے کیا سروکار، یہ بات اُلجھنے والی صورت میں نہیں ہوتی۔"

(جواب) حوالۂ متن: اوپر حصہ الف میں ملاحظہ فرمائیں۔

تشریح: شوکت تھانوی لکھتے ہیں کہ لڑائی تو وہ ہے جس میں بے ساختگی ہو۔ یہ بے ساختگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لڑائی بغیر کسی نیت وقصد کے شروع ہوتی ہے۔ اس میں مزا اور لطف زیادہ ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو خواہ مخواہ کی لڑائی کے تماشے میں ایک دلفریب رونق کا سامان ہے۔ ایسی ایمانداری کی لڑائی دیکھ کر طبیعت ہشاش بشاش ہوجاتی ہے۔ جب کہ لڑائی کی وہ کیفیت جس میں دانستہ دوسرے کو اُلجھایا جاتا ہے، اکثر اس کے نتائج بے لطف اس طرح کر دیتے ہیں کہ الجھانے والا کسی موقع پہ غلطی کا احساس کر کے نادم ہوجاتا ہے۔ یہ ندامت وہ بلا ہے جو سارے مزے کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ اس لیے شوکت تھانوی کو الجھانے کے بجائے اُلجھنے والی لڑائی مرغوب ہے۔

سوال نمبر ۳: مضمون کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے:

(جواب) مرکزی خیال درج بالا صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۴: مضمون ''خواہ مخواہ کی لڑائی'' سے ایسے پانچ جملے منتخب کیجیے جن میں طنز یا مزاح کا کوئی پہلو موجود ہو۔

(جواب) منتخب مزاحیہ جملے:

۱۔ لڑائی تو اس ''وجدانِ آتشیں'' کو کہتے ہیں جس کی نہ کوئی وجہ ہو، نہ کوئی سبب۔

۲۔ اس لفظ ''خواہ مخواہ'' کا کوئی بھی شکریہ ادا نہ کرے گا جس کی بہ دولت ایسی رونق نصیب ہوئی۔

۳۔ جب انسان کا بس دھوبی پر نہیں چلتا تو وہ گدھوں کی تلاش میں نکلتا ہے کہ ان کے کان مروڑے۔

۴۔ یہ تھی خالص لڑائی جو دو بے لوث لڑنے والوں کے درمیان کسی مقصد یا غرض سے نہیں ہوئی بلکہ لڑائی کے آرٹ کی خدمت کے طور پر ہم دونوں لڑے۔

۵۔ الجھ جانے میں چوں کہ کوئی ارادہ نہیں ہوتا، نہ کوئی تیاری ہوتی ہے، لہٰذا یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے چھپّر پھاڑ کر لڑائی کی دولت سے بالکل اچانک طریقے پر مالا مال کر دیا ہے۔

سوال نمبر ۵: اپنے تجربے یا تخیل کی مدد سے کسی ایسی لڑائی یا تو تکار کا حال لکھیے جو بے بنیاد ہو۔

(جواب) خواہ مخواہ کی لڑائی اور ہمارا تجربہ:

سبزی والا: ارے او۔ دیکھتا نہیں، مٹی دھول اڑ کے سبزیوں پہ لگ رہی ہے۔

خاکروب: بگڑتے کیوں ہو؟ ابھی تو میں نے جھاڑو دی ہی نہیں۔

سبزی والا: دی نہیں کے بچے! سڑک تیرا باپ آ کے صاف کرے گا؟

خاکروب: سڑک تمہارے باپ کی ہے جو بیچ سڑک پہ سبزی بیچ رہے ہو؟

سبزی والا: ہاں تو کیا بندھے بندھائے گاہک تیری جھاڑو کے واسطے چھوڑ دوں۔

خاکروب (جھاڑو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے): باسی کدو، سوکھے بینگن لینے والے بھی تیرے گاہک ہوئے۔ قیامت کی گھڑی ہے۔

سبزی والا: مردود! ہوش کر۔ ابھی ٹھنڈا کر دوں گا تجھے۔

خاکروب (آستین چڑھاتے ہوئے): تو آ میرے پاس۔ تیرے بچوں کو یتیم نہ کر دوں تو کہیو۔

سبزی والا (ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے): جا بھی۔ تیری ہڈیوں پہ رحم آتا ہے۔ ورنہ۔۔۔

خاکروب (ایک طرف کو تھوکنے کے بعد): ورنہ کیا؟ جھاڑو اٹھانے والے ہاتھ کو کمزور نہ سمجھ۔ گاما پہلوانوں کو ہوا میں اُچھال کے زمین پہ پٹخ چکے ہیں یہ ہاتھ۔

(راہ گیر جواب تک سڑک پہ کھڑا "جنگ صغیر" کا نقشہ دیکھ رہا تھا، اچانک آگے بڑھتا ہے)

راہ گیر (سبزی والے اور خاکروب دونوں سے مخاطب ہو کر): رکو، رکو۔ شانت ہو جاؤ اور میری سنو بھائیو! دیکھو مسئلے کے حل کی طرف آؤ۔ بھائی سبزی والے! دیکھو چھری تمہارے پاس ہے۔ اور سن کچرے والے! جھاڑو تیرے ہاتھ میں ہے، تو بس شروع ہو جاؤ دونوں۔

سبزی والا (راہ گیر کی طرف گھوم کر): اچھا۔۔۔۔۔! تو تم چاہتے ہو، میرے خلاف پولیس کیس بن جائے۔

خاکروب (جھاڑو زمین پہ پھینک کر): تُو چاہتا ہے کہ میں زخمی ہو کے ہسپتال میں جا پڑوں۔

سبزی والا (آنکھوں میں غصے کے شعلے): میں جیل میں سڑوں۔ عدالتوں کے چکر کاٹوں۔

خاکروب: میری بیوی در در کی ٹھوکر کھائے۔

سبزی والا: میرے بچے سڑکوں پہ رلیں:

(دونوں بیک وقت راہ گیر پہ جھپٹتے ہیں)

راہ گیر (بدلتے ہوئے ماحول سے سہم کر): او بھائی، اچھا۔۔۔ وہ۔ میرا مطلب۔۔۔۔۔۔ میں نے تو بس۔۔۔

(اس طرح سڑک پر صبح سویرے دھوم پٹاخ دھوم پٹاخ کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں)

سوال نمبر ۶: درج ذیل الفاظ اور محاورات کو جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ و محاورات	جملے
وہم و گمان	ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ برسوں کا خدمت گار اتنا جعلساز نکلے گا۔
سرِ راہ	برسوں بعد اُن سے سرِ راہ ملاقات ہوئی تو یوں لگا کہ بہت بڑی نعمت مل گئی۔

مبدۂ فیض	بعض لوگوں پر مبدۂ فیض کا خصوصی کرم ہوتا ہے کہ وہ پریشان حال لوگوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔
ناگاہ	ہم سب ہنس رہے تھے کہ ناگاہ ملنے والی ایک افسوسناک خبر نے ہمیں چونکا دیا۔
بے لوث	جب کسی سے ملو، بے لوث ہو کر ملو۔ ہمیشہ کا اطمینان پا جاؤ گے۔
ناگہانی	ناگہانی آفتوں نے توڑ کے نہ رکھ دیا ہوتا، تو زندگی کے کچھ دن مزے سے گزار جاتے۔
خون کے گھونٹ پی کر رہ جانا	سفاک قاتل کو باعزت بری ہوتا دیکھ کر مقتول کا باپ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔
ترکی بہ ترکی جواب دینا	بھکارن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: "ہاں بابا! غریب ہی تو بیوقوف ہوتے ہیں۔"
گڑے مردے اُکھیڑنا	آج خوشی کے موقع پر گڑے مردے اُکھیڑ کر دل برے نہ کرو۔
آپے سے باہر ہونا	ایک معمولی سی بات پر وہ آپے سے باہر ہو کر مغلظات بکنے لگے۔

سوال نمبر ۷: دی گئی امثال کی روشنی میں درج ذیل الفاظ کی تذکیرہ وتانیث کا تعین کیجیے:

مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث	مذکر	مؤنث
انتقام	فطرت	مباحثہ	طبیعت	تجربہ	لپاڑکی
لطف	رونق	اخلاق	انسانیت	ہنگامہ	سروکار

سوال نمبر ۸: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) لڑائی ہمیشہ شروع ہوتی ہے:
(الف) لپاڑکی سے (ب) خواہ مخواہ سے ✓ (ج) تو تکار سے (د) مار پیٹ سے

(۲) "آپے سے باہر ہونا" ہے:
(الف) ضرب المثل (ب) روزمرہ (ج) محاورہ ✓ (د) تشبیہ

(۳) طنز کا مقصد ہونا چاہیے:
(الف) لڑائی (ب) تکرار (ج) اصلاح ✓ (د) ایذارسانی

(۴) "خون کے گھونٹ پی کر رہ جانا":
(الف) محاورہ ✓ (ب) روزمرہ ہے (ج) ضرب المثل ہے (د) تلمیح ہے

(۵) "وہم وگمان" ہے:
(الف) مرکب توصیفی (ب) مرکب اضافی (ج) مرکب عطفی ✓ (د) مرکب اشاری

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

متعلق فعل: (الف) عرفان نے کتاب خریدی۔

(ب) عرفان نے بازار سے کتاب خریدی۔

(ج) عرفان نے کل بازار سے کتاب خریدی۔

مذکورہ جملوں کو اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے جملے میں عرفان فاعل ہے۔ کتاب مفعول اور خریداری فعل ہے۔ دوسرے جملے میں فعل کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کتاب خریدنے کا کام بازار سے کیا گیا ہے جب کہ تیسرے جملے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کتاب آج نہیں بلکہ کل خریدی گئی ہے وہ تمام الفاظ جو فعل کے معنوں کی وضاحت کرتے ہیں متعلق فعل کہلاتے ہیں۔ ان جملوں میں "بازار سے" اور "کل" متعلقاتِ فعل ہیں جبکہ "نے" علامتِ فاعل ہے۔

سوال نمبر ۹: **"متعلق فعل" پر مشتمل پانچ جملے تحریر کیجیے۔**

(۱) شاگرد نے استاد کو جھک کر سلام کیا۔

(۲) غم زدہ شخص نے در و دیوار پہ حسرت سے نظر ڈالی۔

(۳) وہ کمرے میں ساری رات روتا رہا۔

(۴) حامدہ نے رسی سے کپڑے اُتارے۔

(۵) میں صبح شام چھت پر ناول پڑھتا ہوں۔

مجبوریاں

شفیق الرحمن

پیدائش ۱۹۲۰ء۔ وفات ۲۰۰۰ء

تعارف مصنف: شفیق الرحمن مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے۔ شفیق الرحمن کے والد کا نام عبد الرحمن تھا۔ زمانہ طالب علمی کے دوران کنگ ایڈورڈ کالج لاہور کے ادبی مجلہ کے ایڈیٹر رہے۔ یہ زمانہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۲ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ لڑکپن اور جوانی میں سیر و سیاحت، کرکٹ باکسنگ اور تیراکی میں جنون کی حد تک دلچسپی لیتے تھے جبکہ مصوری اور فوٹوگرافی کا بھی شوق تھے۔ ۱۹۴۲ء میں ساڑھے اکیس برس کی عمر میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میو ہسپتال لاہور میں چند ماہ ہاؤس سرجن رہے اور اسی سال انڈین میڈیکل سروس میں چلے گئے۔ دوسری جنگ عظیم میں مختلف محاذوں پر ملازمت کرنے اور کئی ممالک کی سیر کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد آپ کو بری سے بحری فوج میں منتقل کر دیا گیا جہاں سے ستمبر ۱۹۷۹ء میں سرجن ریر ایڈمرل کی رینک سے بطور ڈائریکٹر میڈیکل سروسز ریٹائر ہوئے۔ دسمبر ۱۹۸۰ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین ہو گئے اور یہاں سے ہی مدت ملازمت کے ختم ہونے کے بعد راولپنڈی میں ریٹائرڈ زندگی گزاری۔

شفیق الرحمن کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو تقسیم ہند سے قبل اور بعد میں ایک اہم ادبی شخصیت کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے خاکہ نگاری، انشائیوں اور مضامین میں بھی مزاح نگاری کو فروغ دیا۔ وہ بے ساختہ انداز میں مزاح تخلیق کرتے ہیں، لہٰذا ان کے ہاں موجود کردار اور واقعات میں بھی بے ساختہ ظرافت اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ شفیق الرحمن کے ہاں کہیں کہیں طنز بھی ملتا ہے۔ البتہ وہ طنز سے زیادہ ظرافت پسند کرتے ہیں۔ وہ مزاح کو تخلیق کرنے میں رعایت لفظی، لطائف، تحریف، بذلہ سنجی، مزاحیہ کرداروں کی حرکات اور صورت واقعہ کو استعمال کرتے ہیں۔ شفیق الرحمن کے مزاح کی سب سے خاص بات ان کا زبردست مشاہدہ اور جزئیات بینی ہے۔ اس کے زور پر وہ ہمارے اردگرد پھیلے روایتی حقائق، کہاوتوں، مقولوں اور الفاظ و محاورات کو ادل بدل کے یا کسی بھی چیز کا دوسرا رخ پیش کر کے نئے نئے مفاہیم سامنے لاتے ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مہار	اونٹ کی نکیل۔ وہ رسی جو نکیل میں بندھی ہوتی ہے	متنفر	بے زار۔ نفرت کرنے والا
حجامت کرانا	سر کے بال کٹوانا۔ ترشوا کر بال درست کرانا	دفعتہً	اچانک۔ فوراً

www.downloadclassnotes.com

پینشن	ریٹائرڈ ملازمین کو ملنے والی ماہانہ رقم	جنابِ من	میرے لیے قابلِ احترام

مرکزی خیال: شفیق الرحمن کی مزاح سے بھرپور یہ تحریر انسانی نفسیات کے گرد گھومتی ہے، جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کی وہ سرگرمیاں جو اُس کے اعصاب پر سوار ہو جائیں تو شب و روز کسی بھی حالت میں اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں حتیٰ کہ نیند کی حالت میں بھی اُس سے وہی کچھ سرزد ہوتا ہے جو عالمِ شعور میں اُس کے شب و روز کا حصہ ہوتا ہے۔

خلاصہ: ہم جس ماحول میں وقت کا بیشتر حصہ صرف کرتے ہیں، وہ ماحول ہمارے مزاج، خیالات، عادتوں اور ذہنی رویوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ جانے انجانے میں مختلف مواقع پر اس کا جا و بے جا اظہار ہو جاتا ہے۔ انسانی رویے کی یہ ناہمواری یا عادت کی مجبوری بعض اوقات ہنسی کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ شفیق الرحمٰن اس عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک موٹر ورکشاپ کے مالک کی عادت تھی کہ حالتِ نیند میں بھی اس کی زبان سے بریک اور اسٹارٹ کے الفاظ کا ظہور ہو جاتا تھا۔ اونٹ پر بیٹھتے تو اچانک لبوں سے ٹپک پڑتا کہ اونٹ کو دوسرا گیئر لگاؤ۔ اسی طرح کچھ بچوں کا احوال ذکر کیا جن کی ریاضی سے کدورت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ اتالیقی (ٹیوٹر) کے ایک امیدوار بچوں کے شوق کی خاطر چھ خرگوش لائے۔ کھیل کھیل میں وہ کچھ خرگوش چھپاتے، کچھ ظاہر کرتے تو ریاضی پڑھنے کے چور بچوں کو ڈر لگ گیا کہ اس بہانے کہیں یہ ہمیں پڑھا ہی نہ دے۔ ایک فلاسفر صاحب کے ذکر سے بھی ان کی بعض عادتوں کا پتہ چلتا ہے کہ کسی کو خط لکھتے ہوئے ساری دماغی اُلجھنیں وہ کاغذ پر انڈیل دیتے تھے۔ ان کی غائب دماغی کا یہ حال تھا کہ کوئی آواز اگر سن لیں کہ میاں صاحب کے گھر کو آگ لگ گئی تو بغیر سوچے سمجھے ہڑبونگ سی مچا دیتے تھے۔ سرکاری محکموں کے عملے کے جامد ذہن کو بھی پُرمزاح اسلوب میں بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کولہو کے بیل کی طرح کے ان کے تیور ہیں۔ عقل اور سمجھ کا یہ عالم ہے کہ پچھلے مہینوں کی پنشن یہ کہہ کے روک لیتے ہیں کہ چوں کہ آپ نے زندگی کا سرٹیفکیٹ جمع نہیں کرایا، اس لیے پتا نہیں آپ زندہ بھی تھے یا نہیں! مصنف کا یہ بھی کہنا ہے کہ کسی کالج یا اسکول کے اسٹاف روم میں چند منٹ بیٹھ کر بغیر کسی تعارف کے ٹیچر کے مضمون کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایک تقریب کا احوال لکھا جہاں مختلف مضامین کے پروفیسر شریک تھے۔ ریاضی کے پروفیسر کی گفتگو میں اعداد و شمار کا ذکر اور جغرافیہ اور تاریخ کے پروفیسروں کی بات چیت میں آب و ہوا اور تاریخ کا اثر تھا۔ فلاسفر غیر ضروری مسئلے میں اپنی ذہنی توانائی صرف کرتے نظر آئے۔

مشق

سوال نمبر۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) موٹر ورکشاپ کا مالک اپنی کس عادت سے مجبور تھا؟

(جواب) موٹر ورکشاپ کا مالک ہونے کی وجہ سے اُس شخص کے اعصاب پر گاڑیوں کے پُرزے سوار رہتے تھے۔ موقع بے موقع اس کا اظہار اس کی گفتگو سے ہو جاتا تھا۔

(ب) حجامت کرانے والے صاحب کیوں شرمندہ ہوئے؟

(جواب) حجامت کرانے والے صاحب ایک فلاسفر تھے جو حجامت کراتے ہوئے فلسفے کے پیچیدہ مسائل سلجھا رہے تھے کہ ناگہاں ان کو آواز سنائی دی کہ میاں عبدالقدوس صاحب کے مکان کو آگ لگ گئی ہے۔ یہ سننا تھا کہ انھوں نے جست لگائی۔ اچھی

خاصی افراتفری پھیلانے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ وہ تو میاں عبدالقدوس ہیں ہی نہیں۔ وہ نادم ہوئے کہ نام پر غور کیے بغیر ناحق انھوں نے اتنا غل مچایا۔

(ج) فلاسفر کے خط سے ان کی کون سی عادت ظاہر ہوتی ہے؟

(جواب) فلاسفر حضرات کائنات کے مسائل کی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے خود اتنے اُلجھ جاتے ہیں کہ روزمرہ گفتگو پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ شک، مفروضات اور امکان کا نقطۂ نظر ان کے روزمرہ کے معاملات میں پیدا ہو جاتا ہے۔ خط لکھنے والا فلاسفر تشکیکی ذہن کا حامل ہے۔ یہ چیز اس کے خط سے ظاہر ہے۔

(د) مصنف نے تقریب میں موجود افراد کو ذرا سی دیر میں کیسے پہچان لیا؟

(جواب) تقریب میں مختلف مضامین کے پروفیسر موجود تھے جو اپنا تعارف نہ بھی کراتے تو ان کی ذرا سی دیر کی گفتگو سے خود بخود اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کا مضمون کیا ہوگا۔ کیوں کہ ان کی عام گفتگو میں بھی ان کے مضمون کا واضح طور پر عکس موجود تھا۔

(ہ) سبق "مجبوریاں" سے اپنی پسند کا مزاحیہ واقعہ منتخب کر کے لکھیے۔

(جواب) ایک مرتبہ وہ (فلاسفر) کسی حجام کی دکان پر حجامت کرا رہے تھے۔ دفعتاً کوئی سڑک پر چلایا: "میاں عبدالقدوس صاحب! میاں عبدالقدوس صاحب!! آپ کے مکان کو آگ لگ گئی۔" وہ تڑپ کے اٹھے، حجام کو پرے دھکیلا۔ گلے کا سفید کپڑا ایک طرف دے مارا، صابن کا جھاگ ایک اور صاحب پر پھینکا۔ دو گاہکوں سے بری طرح ٹکرائے۔ سڑک پر کودے، پھسلے، گرے، پھر اٹھے ایک دہی بڑے والے سے ٹکرائے، اچھل کر بھاگے، کچھ دور جا کر رک گئے اور سر کھجانے لگے۔ پھر شرمندہ ہو کر بولے: "اُفوہ! میں بھی کیا ہوں، بھلا میرا نام عبدالقدوس کہاں ہے؟"

سوال نمبر ۲: مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع اور واحد تحریر کیجیے۔

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
خیال	خیالات	درجہ	مدارج	قصہ	قصص
تقریب	تقاریب	مکان	مکانات	کتاب	کتب
مثال	امثال				

سوال نمبر ۳: درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیے:

"جنابِ من! آپ کے سرٹیفکیٹ کے مطابق اپریل، مئی، جون کی پنشن ارسال ہے۔ براہِ کرم ایک اور سرٹیفکیٹ ارسال فرمائیے کہ آپ اسی سال جنوری، فروری اور مارچ میں بھی زندہ تھے تا کہ آپ کی بقیہ پنشن بھی بھیج دی جائے۔"

(جواب) مندرجہ بالا اقتباس میں سرکاری محکموں کے عملے کا لکیر کا فقیر ہونا مزاح کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر کسی پنشنر کی پنشن کئی ماہ تک بند ہو جائے تو محض آخری تصدیق شدہ صداقت نامے سے کام نہیں چل سکتا۔ روایتی اندازِ ملازمت کی وجہ سے عملے کا اصرار ہوتا ہے کہ پچھلے مہینے کے بھی صداقت نامے جمع کروائیں تا کہ رسمی کارروائی ہو کر فائل کا پیٹ بھرا جا سکے

اور پنشن جاری ہو سکے۔ یہ بھولی بھالی بھیڑیں عقل اور سمجھ سے ذرا کم ہی کام لیتی ہیں۔ حالانکہ سامنے کی بات ہے کہ جو لمحۂ موجود میں اپنی زندگی کا سرٹیفکیٹ جمع کرا رہا ہے، وہ پچھلے مہینوں میں بھی زندہ ہوگا۔

سوال نمبر ۴: درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے:

(۱) اونٹ میں نہیں ہوتے:

(الف) پاؤں (ب) منہ (ج) دم (د) گیئر ✓

(۲) بچوں کو تعلیم دینے کے واسطے استاد لے کر آیا:

(الف) بھیڑیں (ب) کبوتر (ج) طوطے (د) خرگوش ✓

(۳) اگر ایک دن میں ایک کمرہ دس آدمی بنا سکتے ہیں تو وہی کمرہ ایک گھنٹے میں بنا سکتے ہیں:

(الف) ۲۴۰ آدمی ✓ (ب) ۱۲۰ آدمی (ج) ۸۰ آدمی (د) ۶۰ آدمی

(۴) کمشنر نے لکھ دیا:

(الف) خط (ب) مضمون (ج) سرٹیفکیٹ ✓ (د) کالم

(۵) کتب فروش کو خط لکھا تھا:

(الف) ریاضی کے پروفیسر نے (ب) افسانہ نگار نے

(ج) مصنف نے (د) فلاسفر نے ✓

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ایک انار وصد بیمار

ابن انشا (شیر محمد خان)

پیدائش ۱۹۲۷ء۔وفات ۱۹۷۸ء

تعارف مصنف: ابن انشا ضلع جالندھر کے ایک گاؤں پھلور میں پیدا ہوئے اور لندن میں انتقال ہوا۔لاہور سے ۱۹۴۴ء میں گریجویشن کیا۔جامعہ کراچی سے ۱۹۵۲ء میں اردو ادب میں ایم۔اے کیا۔تقسیم سے قبل ہی عملی زندگی کا آغاز ایک زراعتی پرچے میں معاون مدیر کی حیثیت سے کیا۔بعد میں بحیثیت مترجم آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے۔آزادی کے بعد ابن انشا لاہور آ گئے۔یہاں بھی ریڈیو پاکستان میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان کراچی کے نیوز سیکشن میں آ گئے۔۱۹۵۰ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں مترجم کے فرائض انجام دیے۔نیشنل بک کونسل کے قیام کے بعد پہلے سیکریٹری مقرر ہوئے اور پھر یہاں کے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے۔۱۹۷۷ء میں سرکاری حیثیت میں لندن گئے۔ابن انشا نے دنیا کے متعدد ممالک کا دورہ کیا۔ابن انشا کی "چاند نگر"، "اس بستی کے اک کوچے میں"، "دلِ وحشی" (شعری مجموعے) "اردو کی آخری کتاب" "خمارِ گندم" (طنز و مزاح)، "آوارہ گرد کی ڈائری"، "دنیا گول ہے"، "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" (سفرنامے)، "یہ بچہ کس کا بچہ ہے؟" (بچوں کے عالمی دن پر ایک طویل نظم)، "قصہ دم کٹے چوہے کا" (بچوں کے لیے منظوم کہانی)، "میں دوڑتا ہی دوڑتا" (بچوں کے لیے منظوم کہانی)، "بلو کا بستہ اور دوسری نظمیں" اور دیگر اہم تصانیف ہیں۔

الفاظ معنی

القاظ	معنی	الفاظ	معنی
سر پھٹول ہونا	لڑائی میں ایک دوسرے کے سر پھاڑ دینا	مرہم پٹی کرنا	زخم پر دوا لگا کر پٹی باندھنا۔علاج کرنا
ہفت صد	سات سو	اسم مکبر	نام، جس میں چھوٹے سے بڑا پن پایا جائے۔جیسے: لاٹھی سے لٹھ
اتائی	طب کا علم حاصل کیے بغیر علاج کرنے والا	اناڑ	جسے نہ علم ہو نہ تجربہ
ہزار رنگ	کئی قسم کے	ایلوپیتھی	علاج بالضد کا طریقہ۔مغربی طرز کا علاج جس میں مرض کے مزاج کے متضاد دوا دی جاتی ہے

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

ہومیوپیتھی	علاج بالمثل کا طریقہ	وید	حکیم، قدیم ہندوستانی طریقے سے علاج کرنے والا معالج
منجم	نجومی، ستاروں کا علم جاننے والا	جفار	علم جفر (غیب سے واقف ہونے کا علم) کا ماہر
ریل پیل	کثرت۔ بہتات	فارما کوپیا	دواؤں کی تیاری اور استعمال سے متعلق کتاب
جوشاندہ	دواؤں کی تیاری اور استعمال سے متعلق کتاب	خیساندہ	وہ دوا جو بھگو کر پی جائے
سنیاسی بابا	فقیر جو عجیب سی چیزوں سے علاج کرتا ہے	فخر الاطبا	طبیبوں میں قابل فخر، بہت قابل طبیب
بیاض	وہ کتاب جس میں کام کی باتیں لکھ لیتے ہیں۔ ڈائری	صحت تام	مکمل صحت
گرہ میں باندھ لینا	یادداشت میں محفوظ کرلینا	حکمی علاج	قطعی علاج۔ ایسا علاج جس سے شفا لازمی ہو

مرکزی خیال: یہ مضمون ابن انشا کی تحریر ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ابن انشا نے "ایک انار وصد بیمار" کو تحریر کا عنوان دے کر معاشرے میں جس چیز کی کمیابی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہمارے ترقی پذیر معاشرے میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔ ڈاکٹروں کی اور جہالت کی کثرت سے اتائیوں، عاملوں اور جعلی حکیموں کے کاروبار فروغ پاتے ہیں۔ مگر ان فٹ پاتھی معالجوں نے خاندانی نسخوں کا ایسا رعب ڈالا ہوا ہے کہ لوگ علاج کی غرض سے ان کے پاس جاتے ہیں اور موت ان کے حق میں دوا بن جاتی ہے۔ ہلکے پھلکے انداز میں ابنِ انشا نے معاشرے میں علاج کی ابتر صورتِ حال کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ اتائی اپنے جہل کے نشتروں سے بیماروں پر وار کرتے ہیں اور اُن کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ جس معاشرے میں نہ بہتر ذہن پائے جائیں اور نہ صحت مند جسم تو وہاں ترقی کی صورت حال کتنی ابتر ہو جاتی ہے۔

خلاصہ: ابن انشا لکھتے ہیں کہ دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ہمارے یہاں طبی وسائل کی کمی پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ کُل آبادی کے مقابلے میں ڈاکٹروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس صورتِ حال پر "ایک انار سو بیمار" کا محاورہ صادق آتا ہے۔ صحیح معالجین کی ناکافی تعداد اور عوام الناس کی کم علمی نے جعلی معالجوں، عاملوں، اتائیوں، نجومیوں، ستارہ شناسوں، تعویذ دینے والوں اور اس نوع کے دوسرے دعوے داروں کی چاندی کر دی ہے۔ عوام ہیں کہ اپنی ضعیف الاعتقادی سے ان نوسربازوں کے چنگل میں پھنستے جاتے ہیں۔ مصنف ایک بزرگ کا ذکر کر رہے ہیں کہ انھوں نے کراچی کے اتائیوں کی مردم شماری کی تو انھیں اس محاورہ کی تصحیح اس طرح کرنی

پڑی کہ" یک اناڑ وصد بیمار"۔ یہ بات مصنف کے دل کو بھی لگتی ہے کیوں کہ کراچی میں اناڑی ڈاکٹر اور اتائی تھوک کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اناڑیوں کی بہتات میں اگر ڈاکٹر کم بھی ہیں تو کوئی بات نہیں، قبرستان تو یقیناً آباد ہو رہے ہیں، جن کو کبھی نہ کبھی تو آباد ہونا ہی تھا۔

مصنف اپنے ایک پڑوسی کا ذکر کر رہے ہیں کہ انھیں شاید گیس کی بیماری تھی۔ حکمت کی کتابیں لیے اپنے مرض کی تشخیص کی تلاش میں رہتے۔ پہلے تو انھوں نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا، پھر ہومیوپیتھ کے پاس گئے، حکیموں کے جوشاندے بھی ان کے مرض کا مداوا نہ کر سکے۔ آخر میں فٹ پاتھ کے ایک سنیاسی بابا کے خاندانی نسخے پہ عمل کیا اور اگلی دنیا کی سیر پر روانہ ہو گئے۔

مصنف نے بھی اپنی بیاض کی مدد سے حکمت کے شعبے میں طبع آزمائی کی۔ اپنے قریبی عزیز کے گھٹنے کی پھنسی کا علاج کیا تو وہ پھوڑا بن گئی۔ اور میاں رفیق الدین مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کا عنوان بن کے رہ گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں ہسپتال میں داخل کرانا پڑا تا۔ تب کہیں جا کر اس موذی مرض سے جان چھوٹی۔ مصنف کی شہرت اتائی یا عطاءُ الاطبّاء کے نام سے دور دور تک ہونے لگی۔ ایک سنیاسی بابا نے اپنے بہت سے نسخے اور ٹوٹکے مصنف کو دے دیئے تھے۔ اُن سنیاسی بابا کو جیل اس لیے ہوئی کہ اُنھوں نے ایک مریض کا حکمی علاج ایسا کیا تھا کہ مریض کی جان کے لالے پڑ گئے۔ مریض کے لواحقین نے انھیں جیل کی ہوا کھلا دی۔ اسی وجہ سے مصنف کا اتائیوں کو مشورہ ہے کہ علاج صرف ایسے مریضوں کا کریں جن کے رشتے دار پولیس میں نہ ہوں۔ عقل مندوں کے لیے اشارہ کافی ہے۔

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) کراچی میں اوسطاً کتنے مریضوں کے علاج کے لیے ایک ڈاکٹر ہوتا ہے؟

(جواب) ابن انشا کا خیال ہے کہ کراچی میں اوسطاً سات سو مریضوں کے لیے ایک ڈاکٹر ہوتا ہے۔

(ب) مغربی ملکوں میں مریضوں اور ڈاکٹروں کی کیا صورت حال بیان کی گئی ہے؟

(جواب) مغربی ملکوں میں پچاس مریضوں کے لیے ایک ڈاکٹر کی اوسط ہے۔ کہیں یہ تعداد پانچ سات آدمیوں پر ایک ڈاکٹر کی ہوتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں اک ذرا مبالغے کے ساتھ ابن انشا نے لکھا ہے کہ بعض ممالک میں ڈاکٹر اتنی کثرت سے ہیں ایک آدمی کے علاج کے واسطے دو ڈاکٹروں کا تناسب ہے اور وہ دو ڈاکٹر مریض پر سبقت لے جانے کی سعی میں ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ پھر ایک دوسرے کا علاج کر کے گزر بسر کرتے ہیں۔

(ج) سبق میں بزرگ کو کہاوت کی تصحیح کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

(جواب) بزرگ کی رائے میں انار کا قندھار سے خاص تعلق ہے۔ اس لیے کراچی سے " یک انار وصد بیمار" کی کہاوت کو کیا مناسبت۔ ہاں، اگر انار کو "اناڑ" پڑھا جائے تو یہ محاورہ کراچی کی صورتِ حال کے عین مصداق ہو جائے گا۔ کیوں کہ کراچی میں علاج کرنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک اناڑی بیٹھا ہوا ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(د) **مصنف نے علاج کے نام پر کون کون سے طریقوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے؟ اور کیوں؟**

(جواب) ابن انشا نے علاج کے نام پر اختیار کیے گئے مختلف طریقوں مثلاً ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، فٹ پاتھی، حکیم، وید، عامل کامل، منجم، جفار، چینی طب، تعویذ، شفا بخش انگوٹھیوں والوں کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ازراہِ طنز لکھا ہے کہ مذکورہ علاج کے طریقوں سے جڑے افراد کا حساب کیا جائے تو حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ جتنی تعداد بیماروں کی ہے، اتنی ہی ان "مسیحاؤں" کی بھی ہے۔ ان "معالجین" کے ہوتے ہوئے ڈاکٹروں کی کمی کا گلہ بیکار ہے۔ اس لیے محاورہ میں یوں تبدیلی کر لینا چاہیے کہ جتنے بیمار، اتنے اناڑ۔ ان "اناڑوں" کے "فیض" سے بیمار سیدھے قبرستانوں کو جا پہنچتے ہیں۔

(ہ) **حکمی علاج سے کیا مراد ہے؟**

(جواب) حکمی علاج سے مصنف کی مراد یہ ہے کہ کوئی مریض اگر کسی اتائی کے ہتھے چڑھ جائے، تو "خدایا! تیرا ہی آسرا" والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ رب کو منظور ہو تو اتائی نسخے مریض کو سیدھا قبرستان کی راہ دکھا دیتے ہیں۔ اگر رب ہی کی مرضی نہ ہو تو اتائی کی ساری "جدوجہد" دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور مریض بحکم خداوندی بچ جاتا ہے۔

(و) **میاں رفیق الدین کا علاج کس طرح ہوا؟**

(جواب) میاں رفیق الدین کے گھٹنے پر معمولی سی پھنسی نکلی تھی۔ اتائی کے مرہم نے پھنسی کا خاتمہ اس طرح کیا کہ پھنسی کو پھوڑے میں بدل دیا۔ پھوڑے کا تدارک پوڈر کے چھڑکاؤ سے کرنے کی کوشش کی گئی تو آس پاس مزید پھوڑے نکل آئے۔ اتائی کا علاج ایسا "بابرکت" ثابت ہوا کہ آپریشن کی نوبت آ گئی۔ ہسپتال میں آپریشن کے بعد کہیں تین چار مہینے میں جا کے وہ صحت یاب ہوئے۔ اب کوئی ہے جو اتائیوں کی "کرامت" کا منکر ہو۔۔۔۔۔۔۔!!

(ز) **مصنف نے کس معاشرتی رویے کی نشان دہی کی ہے؟**

(جواب) مصنف نے معاشرے کے ان افراد کی پست ذہنی اور سطحی سوچ کو بیان کیا ہے جو سائنس و طب میں انقلابی تبدیلیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود خود کو اتائیوں اور سڑک چھاپ حکیموں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ نہ صرف صحت جیسی قیمتی چیز سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، بلکہ اس میں جان کا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) "ایک انار و صد بیمار" میں حالات بیان کیے گئے ہیں:

(الف) معاشرتی (ب) طبی ✓ (ج) انتقامی (د) اخلاقی

(۲) "ایک انار و صد بیمار ہے":

(الف) افسانہ (ب) ناول (ج) ڈراما (د) مزاحیہ مضمون ✓

(۳) "ایک انار و صد بیمار" میں طنز کیا گیا ہے:

(الف) ڈاکٹروں پر (ب) حکیموں پر (ج) عاملوں پر (د) اتائیوں پر ✓

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(۴) مصنف کی ڈائری بھری ہوئی تھی:

(الف) کالموں سے (ب) اشتہاروں سے (ج) ٹوٹکوں سے ✓ (د) اشعار سے

(۵) "ایک انار وصد بیمار" قواعد کی رو سے ہے:

(الف) لفظ (ب) فقرہ (ج) محاورہ (د) کہاوت ✓

سوال نمبر ۳: درج ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:

الفاظ	جملے
اُفق	دریچے کے باہر دیکھا تو اُفق پر پھیلے رنگ ایک دلفریب منظر پیش کر رہے تھے۔
اوسط	اکثر سوشل میڈیا پر لکھنے والوں کی تحریریں اوسط درجے کی ہوتی ہیں۔
شیوہ	مومن کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ جائے۔
ریل پیل	اکثر پیسے کی ریل پیل انسان کو غرور میں مبتلا کر دیتی ہے۔
مُداوا	ماں ہی اپنے بچوں کی پریشانی کا مداوا کرتی ہے۔

سوال نمبر ۴: سبق کا مرکزی خیال تحریر کیجیے۔

(جواب) سبق کا مرکزی خیال پچھلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۵: درج ذیل عبارت کی تشریح بہ حوالہ متن کیجیے:

"بزرگ نے رات کو ایک ہی خوراک استعمال کی تھی کہ دوسرے دن کی ہمیں دفتر سے چھٹی لینی پڑی۔"

(جواب) حوالہ سبق: یہ اقتباس ابن انشا کے مضمون "ایک انار وصد بیمار" سے لیا گیا ہے۔

تشریح: ابن انشا لکھتے ہیں کہ کراچی شہر میں ایک پریشان حال مریض علاج کی تمام صورتوں سے حسبِ توفیق فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کے بارے میں لکھا کہ انھیں معدے میں گیس کی شکایت نے پریشان کر رکھا تھا۔ اول اول ڈاکٹر سے رجوع کیا، پھر ہومیو ڈاکٹر اور حکیموں کے پاس گئے مگر شفا نہ ہو پائی۔ شفا پانے کی آرزو میں بالآخر انھوں نے فٹ پاتھ پہ ٹھیہ جمائے ہوئے ایک سنیاسی بابا سے نسخہ لیا۔ اس جان توڑ نسخے نے انھیں نہ صرف مرض سے، بلکہ زندگی کے بوجھ سے بھی آزاد کر دیا۔ ناچار اگلے دن مصنف کو دفتر سے چھٹی لینا پڑی تاکہ مرحوم کی تدفین و تکفین میں شرکت کر سکیں۔

سوال نمبر ۶: سبق میں شامل محاورے چُن کر لکھیے اور اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

محاورات	جملے
سر پھٹول ہونا	کسی کو اندازہ نہ تھا کہ ذرا سی بات اتنی بڑھ جائے گی کہ آپس میں سر پھٹول ہونے لگے گی۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

گزارہ چلنا	جب تک والد کے ہاتھ پاؤں سلامت رہے، گھر کا گزارہ چلتا رہا۔
دنیا سے سفر کرنا	گزشتہ رات میرے ایک عزیز اس فانی دنیا سے سفر کر کے اُس جہان میں پہنچے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔
جی کو لگنا	اُس مردِ قلندر کی بات جی کو لگی کہ "دنیا کی حلاوتیں جاہلوں کے لیے اور تلخیاں عاقلوں کے لیے ہیں۔"
کندھا دینا	نیک شخص کے جنازے کو کندھا دینا ہر شخص سعادت سمجھتا ہے۔
پیشہ سے جلنا	اپنے ہم پیشہ لوگوں سے جلنے کے بجائے محنت، استقلال اور دیانت داری پر یقین رکھنا چاہیے۔
طعنہ دینا	بات بات پہ طعنہ دینے والے کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔
حرف رکھنا	دنیا تم پر خواہ کتنا ہی حرف رکھے، تم مخلوقِ خدا کی خیر خواہی کیے جاؤ۔
گرہ میں باندھنا	یہ بات گروہ میں باندھ لو کہ پُرامید ہو کر سفر کرنا، منزل پر پہنچنے سے بہتر ہے۔

سوال نمبر ۷: درج ذیل جملوں کا مفہوم واضح کیجیے:

(الف) **"انھوں نے ایک مریض کا حکمی علاج کیا تھا"**

(جواب) مصنف نے حکیموں کے علاج معالجے کو ازراہِ مزاح "حکمی علاج" کا عنوان دیا ہے جس میں شفایابی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ ایسا مریض خدا کے دائرہ اختیار میں چلا جاتا ہے۔ اس کا حکم ہوگا تو بچ رہے گا ورنہ اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔

(ب) **"اناڑیا اتائی ہزار رنگ اور ہزار شیوہ ہوتے ہیں۔"**

(جواب) اتائی اور جعلی حکیموں کو ایک انار اور سو بیمار کے محاورے میں تصرف کر کے "اناڑ" کہا گیا ہے جو لفظ اناڑی پہ بھی بھاری ہے۔ ان "اناڑوں" کی کئی قسمیں اور ان کے بہت سے طریقہ ہائے علاج (یا طریقہ واردات) ہوتے ہیں۔

(ج) **"قبرستانوں کی آبادکاری ہی تو منظور ہے۔"**

(جواب) قبرستان انسان کی آخری آرام گاہ ہے۔ آج نہیں تو کل خالی قبرستانوں کو آباد ہونا ہی ہے۔ بھانت بھانت کے اتائیوں، سنیاسی، بابوں اور اناڑی ڈاکٹروں کے دم سے قبرستان وقت سے پہلے آباد ہو رہے ہیں۔

اشتقاق۔ مشتقات:

لفظ "مدبر" سے ایک نیا لفظ "مدبرانہ" بنا ہے یعنی اصل لفظ میں "انہ" شامل کر دیا گیا ہے اس عمل کو "اشتقاق" اور جو نیا لفظ بنایا گیا، اُسے "مشتق" کہتے ہیں:

سوال نمبر ۸: آپ بھی درج ذیل الفاظ سے اسی طرح نئے الفاظ بنائیے:

بزرگ	بزرگانہ	رفیق	رفیقانہ	نقاد	نقادانہ
مریض	مریضانہ	حکیم	حکیمانہ	-	-

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

خطِ غالب بہ نام میر مہدی مجروح

مرزا اسد اللہ خاں غالب

پیدائش ۱۷۹۷ء۔ وفات ۱۸۶۹ء

تعارف مصنف: مرزا اسد اللہ خان غالب نے جس طرح اردو شاعری میں ایک منفرد انداز اختیار کیا اسی طرح وہ اردو نثر میں بھی ایک خاص طرز کے موجد ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط کے مجموعے "عود ہندی" اور "اردوئے معلٰی" کی اشاعت کو جدید اردو نثر کا باقاعدہ منشور تسلیم کیا گیا ہے۔ غالب نے ۱۸۵۰ء سے اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے اس سے پہلے وہ فارسی میں بہت اہتمام سے خطوط لکھا کرتے تھے لیکن ان کے اردو خطوط نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی اور قدیم طرز کی پر تکلف مکتوب نگاری تھوڑے ہی عرصے میں بالکل ختم ہوگئی۔ غالب کے خطوط سے ان کی شخصیت اور مزاج و مذاق کی پوری تصویر بنتی ہے۔ غالب کی شاعری ان کی شخصیت اور مزاج کے کچھ رُخ ضرور متعین کرتی ہے لیکن غالب کی شخصیت اور ان کے ادبی مزاج و مذاق کا اظہار ان کے خطوط میں ہوتا ہے۔ خطوط غالب وہ شفاف آئینہ ہے جس میں غالب اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ غالب کی زندگی جہاں ابتدائی طور پر لہو و لعب اور عیش و عشرت کی زندگی تھی وہاں ایک کش مکش اور مصیبت اور آزمائش کی کہانی بھی ہے۔ غالب کی شخصیت میں خلوص، صداقت، بے تکلفی اور برجستگی تھی اسی سبب ان کے خطوط نجی حالات سے لے کر اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کی وضاحت کرتے ہیں۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مکتوبات	مکتوب کی جمع۔ خطوط۔ مکاتیب	دماغ چل جانا	سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جانا۔ عقل نہ رہنا
مجتہد العصر	اپنے زمانے کا مجتہد	مسودہ	لکھی ہوئی کتاب کی پہلی شکل کہ جس کی درستی ابھی باقی ہو
شاہی روش	بادشاہ کے دور کے انداز	برخوردار	چھوٹا۔ سعادت مند
ابرِ بے باراں	بادل جو برسات نہ کرے	میوہ	پھل
خانہ بے چراغ	خالی مکان۔ جو آباد نہ ہو	چراغ بے نور	بجھا ہوا چراغ
امر	کام۔ معاملہ	زوائد	زائد (زیادہ۔ فضول) کی جمع
چاہِ بے آب	اندھا کنواں۔ وہ کنواں جو سوکھ چکا ہو	خوشنودی	خوشی۔ رضامندی

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

نگارش	تحریر	پھاوڑا بجنا	مکان گرانا۔ڈھینا
دمدمہ	مورچہ،مٹی بھری بوریوں سے بنائی ہوئی دیوار	نبڑنا	تمام ہونا۔پورا ہونا

تعارف مکتوب الیہ: میر مہدی مجروح کا پورا نام میر مہدی حسین تھا۔وہ ۱۸۳۳ء کے آس پاس دہلی کے محلہ اردو بازار میں پیدا ہوئے، جو لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان واقع تھا۔وہ نجیب الطرفین سید تھے میر مہدی مجروح کے والد میر حسین نگار بھی شاعر تھے ۔مجروح کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔مجروح نے لڑکپن میں ہی شاعری شروع کر دی تھی اور مرزا غالب،نواب مصطفیٰ خان شیفتہ،شیخ ابراہیم ذوق،حکیم مومن خان مومن اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسی شخصیات کی صحبت میں وقت گزارا۔مجروح غالب کے شاگرد تھے لیکن انھوں نے غزل میں استاد کی پیروی نہیں کی البتہ نثر میں ان کا ساتھ دینے کی ضرور کوشش کی۔غالب ان کی نثر کے مداح تھے اور ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ مجھے تمھاری نثر پر رشک آتا ہے۔۱۸۵۷ء کی ابتدا تک تو شعروسخن کی یہ محفلیں آباد رہیں،لیکن ۱۸۵۷ء کی بدامنی نے شہر کے شرفاء کی جان ومال کو غیر محفوظ بنا دیا۔مجروح بھی اپنے خاص دوست خواجہ الطاف حسین حالی کے پاس پانی پت چلے گئے۔مجروح نے جیسے تیسے پانچ برس پانی پت میں گزارے لیکن اس دوران ان کو دہلی کی یاد ستاتی رہی۔جب دہلی میں کچھ امن وامان قائم ہوا تو مجروح دہلی واپس آ گئے۔

حوالہ سبق: یہ اقتباس شاملِ نصاب سبق ''خطِ غالب بہ نام میر مہدی مجروحؔ'' سے لیا گیا ہے۔

اقتباسات کی تشریح

(۱) ''ہاں صاحب !تم کیا چاہتے ہو؟ مُجتہد العصر کے مُسَوَّدے کو اصلاح دے کر بھیج دیا۔اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔تمھارا دماغ چل گیا ہے۔لفافے کو کُریدا کرو۔مُسَوَّدے کو بار بار دیکھا کرو، پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں کہ یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔''

تشریح: اس اقتباس میں غالب میر مہدی مجروح سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ میں نے مجتہد العصر مولانا سرفراز حسین کے مسودے کی اصلاح کر کے انھیں بھیج دیا ہے اور اب میں انھیں کیا لکھوں؟ وہ میر مہدی مجروح سے کہتے ہیں کہ تم میرے ہم عمر نہیں ہو بلکہ مجھ سے چھوٹے ہو تو میں تمھیں کیوں سلام لکھوں۔کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کیا کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں کوئی درویش یا فقیر نہیں ہوں کہ دعائیں دیتا پھروں۔تمھارا دماغ صحیح ہے؟ ذرا لفافے کو صحیح سے دیکھو،مسودے کو بھی اچھی طرح سے بار بار دیکھ لیا کرو کہ اُس میں کیا ہے؟ اب وہ دور گیا جب آداب والقابات کے ذریعے گفتگو کا آغاز ہوتا تھا کہ یہاں سب خیریت ہے اور وہاں بھی عافیت ہوگی، مجھے یہ نہیں پسند۔

(۲) "اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو۔ گویا وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہِ بے آب ہے۔ ابرِ بے باراں ہے۔ نخلِ بے میوہ ہے۔ خانۂ بے چراغ ہے، چراغِ بے نور ہے۔"

تشریح: پرانے لوگوں کا طریقہ تھا کہ وہ خط بہت پُرتکلف انداز سے لکھا کرتے تھے۔ فارسی روایت کے زیرِ اثر خط میں لفظی آرائش کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ اس دماغ سوزی کے نتیجے میں خط لکھنے کا اصل مقصد فوت ہو جاتا اور مطلب کی بات الفاظ کے بھاری بھرکم پہاڑ تلے دب کے رہ جاتی۔ تحریر بے معنی ہو کر رہ جاتی اور جو اصل بات اُس میں کہی جاتی اُس کا اثر ضائع ہو جاتا تھا۔ آمنے سامنے گفتگو کرتے ہوئے جس طرح کا فطری انداز ہوتا تھا، خطوط نگاری میں اس کے بالکل برعکس تھا۔ مکتوب نگار ادائے مطلب پر توجہ دینے کے بجائے انشا پردازی کرنے لگتے تھے۔ خط نویسی کی اس قدیم روش کی بھد اُڑاتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ کام کی بات جسے کم لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہو، اس کو الفاظ و تراکیب کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا بے کار بات ہے۔ زیرِ نظر خط میں غالب چند تراکیب چاہِ بے آب، ابرِ بے باراں، نخلِ بے میوہ، خانۂ بے چراغ، چراغِ بے نور وغیرہ کو بطور استہزا و طنز درج کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی دلی تسکین کے لیے اس بناوٹی انداز کو خط کا لازمی حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ مرزا غالب خط کو بات چیت کی ایک صورت سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں ایک خط مکتوب نگار کے جذبات کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی زبان و بیان صاف اور بلاتکلف ہونی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے خط نویسی میں سادگی اور بے تکلفی کو اختیار کیا اور پُرتکلف القاب و آداب، غیر ضروری تمہید ترک کر دی۔ زیرِ نظر اقتباس میں غالب داد طلب انداز میں اپنی اس اختراع کی طرف مکتوب الیہ کی توجہ دلا رہے ہیں۔

(۳) "شہر چپ چاپ، نہ کہیں بھاوڑا بجتا ہے، نہ سرنگ لگا کر کوئی مکان اڑایا جاتا ہے، نہ آہنی سڑک آتی ہے، نہ کہیں دمدمہ بنتا ہے۔ دلی شہر خموشاں ہے۔"

تشریح: اس اقتباس میں جنگِ آزادی کے بعد کی دلی کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ شہر میں ہر جگہ بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ نہ کوئی ہل چل ہے نہ کوئی آہٹ۔ کسی جگہ نہ کھدائی ہو رہی ہے اور نہ ہی کسی گھر کو مسمار کیا جا رہا ہے۔ نہ کوئی پختہ سڑک موجود ہے۔ نہ کہیں کوئی عارضی قلعہ بنایا جا رہا ہے۔ ہر جگہ خوف کا عالم ہے لوگ انگریز فوج سے ڈر کر اپنے گھروں میں محصور ہیں اور غالب بھی اسی طرح اپنے گھر میں محصور ہیں۔ اس وقت دلی شہر بالکل ویران ہے اور یہ ویرانی قبرستان کی ویرانی جیسی ہے۔

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) خط کے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے نام لکھیے:

(جواب) اس خط کے مکتوب نگار مرزا اسد اللہ خان غالب اور مکتوب الیہ "میر مہدی مجروح" ہیں۔

(ب) خط نویسی کے سلسلے میں محمد شاہی روش سے غالب کی کیا مراد ہے؟

(جواب) غالب خط میں محمد شاہی دور کے تکلفات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پرانے وقتوں میں لوگ اپنے خطوط میں آداب و القابات

کے ذریعے گفتگو کا آغاز کرتے تھے کہ یہاں سب خیریت ہے اور وہاں بھی عافیت ہوگی۔ غالب کو یہ اندازِ تحریر بالکل پسند نہیں تھا۔

(ج) خط سے بے تکلف گفتگو کی ایک مثال لکھیے۔

(جواب) بے تکلف خط نویسی کی مثال: "کیوں سچ کہیو۔ اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؟ ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو۔ گویا وہ خط ہی نہیں ہے۔"

(د) غالب نے اس خط میں نئے اندازِ خط نگاری کے حوالے سے کن اُمور کی نشان دہی کی ہے؟

(جواب) شاملِ نصاب خط میں سادگی اور بے تکلفی کی وہ فضا موجود ہے جو غالب کے خطوط کا خاصہ ہے۔ غالب کے خیال میں بے تکلفانہ گفتگو کا تقاضا ہے کہ تحریر ہر طرح کے ادبی اور لسانی تکلفات سے پاک ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ غیر ضروری تمہیدیں اور پُرتکلف بیان کے بجائے اپنا مدعا فطری انداز میں پیش کرنا چاہیے۔ غیر ضروری القاب و آداب، مزاج پُرسی، خیریت نگاری کا قدیم دستور ترک کر دینا چاہیے۔

سوال نمبر ۲: درج ذیل اقتباسات کے مفہوم کی وضاحت کیجیے:

(جواب) اقتباس کی تشریح اوپر ملاحظہ ہو۔

سوال نمبر ۳: درج ذیل تراکیب کی وضاحت کیجیے:

تراکیب	وضاحت
چاہِ بے آب	ایسا کنواں جو بالکل خشک ہو چکا ہے
ابرِ بے باراں	بارش نہ برسانے والی گھٹا۔ جس سے بارش کی کوئی اُمید نہیں۔
نخلِ بے میوہ	بے پھل دار درخت۔ جس پر کوئی پھل موجود نہ ہو۔
خانہ بے چراغ	اندھیرا گھر۔ جہاں کسی طرح کی روشنی کی کوئی اُمید نہیں۔
شہرِ خموشاں	قبرستان۔ یہاں مراد دلی شہر کی بربادی ہے۔

سوال نمبر ۴: درج ذیل کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

تراکیب	جملے
روش	ہمیں ہر صاحبِ علم کی روش اختیار کرنا چاہیے۔
شیوہ	صوفیا کا شیوہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔
موقوف	اُس نے اپنا مری کا پروگرام موقوف کر دیا۔

زوائد	ماہرینِ اقبالیات کی رائے میں کلامِ اقبال حشو وزوائد سے پاک ہے۔
نگارش	مکتوب نویسی میں غالب کا اندازِ نگارش عوام میں بے حد مقبول ہے۔

سوال نمبر ۵: درج ذیل الفاظ کے واحد جمع لکھیں:

واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
صاحب	صاحبان	اصلاح	اصلاحات	مجتہد	مجتہدین
خموش	خموشاں	نگارش	نگارشات	–	–

سوال نمبر ۶: اس خط کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟ تحریر کیجیے:

(جواب) مرزا غالب نے خطوط نویسی کا جو طریقہ کیا، اور اس میں جو جدتیں پیدا کیں اور جس کمال کے ساتھ اُسے برتا، اس میں غالب یکتا ہیں۔ وہ بے تکلف دوستوں کو خط لکھتے ہوئے ہر قسم کی باتیں بڑی بے ساختگی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں۔ غالب کے خطوط بالعموم رسمی القاب و آداب سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اُن کا اپنا قول ہے: ''میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے پکارتا ہوں جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے اور پھر مطلب لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔'' بے تکلف گفتگو جس قسم کے اسلوب کا تقاضا کرتی ہے وہ شاملِ نصاب خط میں بھی موجود ہے۔ اس لیے غالب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''میں نے ایسا اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔''

سوال نمبر ۷: درست جواب پر (✓) کا نشان لگایئے:

(۱) مجتہد العصر کے مسودے کو بھیج دیا:

(الف) لکھ کر (ب) اصلاح دے کر ✓ (ج) پڑھ کر (د) سُن کر

(۲) تم میرے ہم عمر نہیں جو لکھوں:

(الف) سلام ✓ (ب) دعا (ج) خط (د) قصیدہ

(۳) سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح بھیجتے رہو:

(الف) سلام (ب) دعا (ج) دوا (د) خط ✓

(۴) بار بار دیکھا کرو:

(الف) مسودے کو ✓ (ب) خط کو (ج) تقریر کو (د) تحریر کو

(۵) قصور معاف کرو:

(الف) خفا نہ ہو ✓ (ب) خوش نہ ہو (ج) مسرور نہ ہو (د) بے زار نہ ہو

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

خطِ اقبال

خان محمد نیاز الدین خاں کے نام

ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال

پیدائش ۱۸۷۷ء۔ وفات ۱۹۳۸ء

تعارف مصنف: علامہ محمد اقبال ایک بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے ایک بڑے دانشور اور مفکر بھی ہیں۔ ان کے خطوط ان کی فکر و دانش کا مرقع ہیں۔ یہ خطوط ان کی عظیم شخصیت کے بہت سے ایسے پہلو بھی نمایاں کرتے ہیں جن کا اظہار ان کی شاعری میں نہیں ہو سکا۔ غالب کے بعد علامہ اقبال کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اپنی چالیس سالہ ادبی زندگی میں انھوں نے معاصرین، رشتہ داروں، عام قاری، مداحین، سیاسی رہنماؤں، اخبار نویسوں، علما، شعرا اور اہل خانقاہ غرض ہر شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کو خطوط لکھے۔ اقبال کا پہلا خط مولانا احسن مارہروی کو لکھا گیا تھا۔ خط لکھنے میں اقبال کے یہاں کوئی اہتمام یا تصنع نہیں تھا۔ خطوط کی عبارت بھی عموماً بے تکلف ہوتی تھی۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرتے تھے۔ شدید رنج یا خوشی میں بھی اپنے جذبات کا اظہار بے دھڑک نہیں کرتے تھے۔ القاب بہت مختصر اور مکتوب الیہ کے رتبے کی رعایت سے لکھتے تھے۔ ان کے خطوط میں اختصار کے ساتھ جامعیت ہوتی تھی۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
آلام وافکار	فکریں اور پریشانیاں	موجب	وجہ
اسکول	سوچ، اندازِ فکر	بودا	کم زور
ضعیف چیتھڑا	بوسیدہ کپڑے کا ٹکڑا	اصول حقہ	حقیقی اصول
مرور ایام واعصار	دنوں اور زمانوں کی گردش	اعصار	عصر (زمانہ، دور، وقت) کی جمع

مکتوب الیہ کا مختصر تعارف: خاں محمد نیاز الدین خاں ۱۸۶۵ء میں بستی دانشمنداں کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مشن ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں لا میں داخلہ لیا۔ مختاری کا امتحان پاس کر کے جالندھر میں وکالت کا کام شروع کیا۔ کچھ عرصے کے بعد نائب تحصیل دار بھرتی ہو گئے۔ پھر تحصیل دار، افسر مال، افسر خزانہ، سب جج، سینیر جج اور قائم مقام سیشن جج بھی رہے۔ ۱۹۱۴ء میں سینیر سب جج کے عہدہ سے پنشن یاب ہوئے۔ مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ علم دوستی ہی کی وجہ سے علامہ اقبال سے رابطہ اور ملاقات شروع ہوئی۔ اخبار "وکیل" امرتسر، "مسلم آؤٹ لک" لاہور اور "معارف" اعظم گڑھ (یوپی) کے لیے مضامین لکھتے تھے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

حوالہ سبق: یہ اقتباس شاملِ نصاب سبق 'خطِ اقبال خان محمد نیاز الدین خاں کے نام' سے لیا گیا ہے۔

اقتباسات کی تشریح

(۱) "واقعی آم درد گردہ کے مریض کے لیے اچھا ہے اور مجھ کو بھی اس سے بہت محبت ہے۔ کھانے کی چیزوں میں صرف یہی ایک چیز ہے جس کے لیے میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ باقی چیزوں کے لیے خواہش نہیں ہوتی، یہاں تک کہ روزمرہ کا کھانا بھی عادت کے طور پر کھاتا ہوں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔"

تشریح: اس اقتباس میں علامہ اقبال آم کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گردے کا کیسا ہی مریض کیوں نہ ہو، اگر وہ آم کھالے تو صحت یاب ہوجائے۔ مجھے بھی آم سے بہت محبت ہے، کسی چیز کی طرف بھی طبیعت مائل نہیں ہوتی مگر آم سامنے ہوں تو دل میں خود بخود آم کھانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ مجھے کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہوتی بلکہ روزمرہ کا کھانا بھی عادتاً کھاتا ہوں، خواہش سے نہیں۔ باقی یہاں پر اللہ کا فضل و کرم اور خیریت ہے۔

(۲) "رموزِ بے خودی" کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا، مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری مضامین باقی ہیں، یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیاتِ ملیہ اسلامیہ میں کیا ہے۔ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصہ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہیے۔"

تشریح: اس اقتباس میں اقبال کہہ رہے ہیں کہ میں نے اپنے خیال میں "رموزِ بے خودی" کو ختم کرلیا ہے۔ مگر مجھے پرسوں احساس ہوا کہ یہ کام ابھی باقی ہے۔ جب میں مضامین کی ترتیب دے رہا تھا تو اس بات کا خیال ذہن میں آیا کہ دو تین ضروری مضامین کی اب بھی ضرورت ہے۔ یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم، بیت الحرام پاکیزہ جگہ یعنی خانہ کعبہ اسی طرح مسلمانوں کی ملی حیات پر بھی لکھنا باقی ہے، یہ تمام چیزیں جب میں لکھ لوں گا تو میں اس مثنوی کو ختم سمجھوں گا۔ مگر ابھی اس میں بہت کام باقی ہے۔ ان موضوعات سے پتا چلتا ہے کہ علامہ اقبال کو دین اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی بابت غور و خوض میں کس قدر گہری دلچسپی تھی۔

(۳) "یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔"

تشریح: اقبال اس اقتباس میں فرمارہے ہیں کہ جو یورپ اپنی ترقی پر ناز کرتا ہے اور سرشار رہتا ہے۔ دراصل وہ ترقی نہیں ہے بلکہ ایک ناپائیدار نظام ہے جو بھس بھسا اور کمزور ہے۔ یورپی قوم کو جسے اپنی برتری کا احساس ہمیشہ رہتا ہے۔ اقبال نے اُسے ایک ضعیف چیتھڑا کہہ کر پکارا ہے۔ ایک کمزور پھٹے ہوئے کپڑے کی مانند اس کا تانا بانا کمزور ہے۔ عنقریب یہ سارا نظام زمین بوس ہوجائے گا۔

مشق

سوال نمبر ا: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) **مولانا گرامی کے جالندھر آنے کی خبر پر اقبال نے کیا لکھا؟**

(جواب) علامہ اقبال نے مولانا گرامی کے جالندھر آنے کی اطلاع پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی صحبت سے زیادہ پُرلطف اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔

Visit www.downloadclassnotes.com for Notes, Old Papers, Home Tutors, Jobs, IT Courses & more.

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

(ب) اقبال نے آم کے بارے میں کیا رائے دی ہے؟

(جواب) علامہ اقبال نے آم کی افادیت بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ گردہ کے مریضوں کے لیے بہت اچھا ہے۔ یہی ایک چیز ہے جسے کھانے کی مجھے خواہش ہوتی ہے ورنہ باقی کھانا تو میں عادتاً کھاتا ہوں۔

(ج) اقبال نے اپنی تصنیف "رموزِ بے خودی" کے بارے میں کیا لکھا ہے؟

(جواب) "رموزِ بے خودی" کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ ختم ہو چکی ہے مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی یہ ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین کے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ دو تین ضروری مضامین یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیات ملیہ اسلامیہ کا فلسفہ اس میں پیش کیا جائے۔

(د) یورپ کے نظریہ قومیت کے بارے میں اقبال کا کیا موقف ہے؟

(جواب) یورپ کے نظریہ قومیت پر اقبال کا موقف ہے کہ جس قومیت پر یورپ ناز کرتا ہے دراصل وہ محض بودے اور سُست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ یعنی اُن کی نظر میں یورپی نظام ناکارہ اور ناپائیدار ہے۔

سوال نمبر ۲: درج ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کیجیے:

الفاظ تراکیب	وضاحت
مرورِ ایام و اعصار	دنوں کا گزرنا، زمانے کا بیت جانا، وقت کا گزرنا۔ متعدد زمانے، عہد
حیاتِ ملیہ اسلامیہ	اسلامی طرزِ زندگی یا عملی زندگی میں سلامی روایات کی پاسداری
آلام و افکار	غموں اور پریشانیوں کی کثرت
اعجازِ مسیحائی	معجزہ یا کرشمہ۔ عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ، مردے کو زندہ کرنے اور مریضوں کو شفایاب کرنے کا عمل
رموزِ بے خودی	خودی میں نہ رہنے کا راز۔ عالم وجد کا راز

سوال نمبر ۳: درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کیجیے:

تراکیب	جملے
فکر	ہر مسلمان کو اللہ سے قربت کی فکر ہمیشہ رکھنی چاہیے۔
الم	قدرت نے شاہوں کے لیے تاج و علم اور عاشق کے لیے رنج و الم رکھے ہیں۔
ایام	سختی ایام میں بھی انسان کو ثابت قدم رہنا چاہیے۔
مطالب	حکایاتِ سعدی میں ایسے اعلیٰ مطالب پائے جاتے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔
ملت	ملتِ اسلامیہ ایک گل دستے کی مانند ہے۔

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

سوال نمبر ۴: درج ذیل اقتباس کی تشریح بہ حوالہ متن کیجیے:

"یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔"

(جواب) اس اقتباس کی تشریح سبق میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر ۵: درج ذیل غلط فقرے درست کیجیے:

غلط فقرے	درست فقرے
(الف) بندہ خدا دیر مت اتنی کیا کرو۔	بندہ خدا اتنی دیر مت کیا کرو۔
(ب) میں نے تم کو پہلے ہے لکھا بھی۔	میں نے تم کو پہلے بھی لکھا ہے۔
(ج) یوں آتا تو نہیں پڑھنا۔	یوں تو پڑھنا نہیں آتا۔
(د) تم کرو ایک ایک منٹ کی قدر۔	تم ایک ایک منٹ کی قدر کرو۔
(ہ) دعا نری سے چلتا نہیں کام۔	نری دعا سے کام نہیں چلتا۔

سوال نمبر ۶: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) مولوی گرامی صاحب بھی آلام و افکار کے سلسلے میں ہیں:

(الف) آزاد ✓ (ب) گرفتار (ج) پابند (د) گھرے ہوئے

(۲) آم مریض کے لیے اچھا ہے:

(الف) دردِ دل کے (ب) دردِ گردہ کے ✓ (ج) دردِ سر کے (د) دردِ جگر کے

(۳) گزشتہ سال مجھے لنگڑا آم بھیجا تھا:

(الف) مولانا اکبر نے ✓ (ب) مولانا ظفر نے (ج) مولانا حسرت نے (د) مولانا اصغر نے

(۴) رموزِ بے خودی ہے:

(الف) مثنوی ✓ (ب) قصیدہ (ج) غزل (د) مخمس

(۵) اس صورت میں اس سے پہلے کبھی پیش نہیں کیا گیا:

(الف) ملتِ اسلامیہ کا فلسفہ ✓ (ب) ملتِ اسلامیہ کا نظریہ

(ج) ملتِ اسلامیہ کا جغرافیہ (د) ملتِ اسلامیہ کا عقیدہ

For more notes & academic material visit our Website or install our Mobile App
Website: www.downloadclassnotes.com Mobile App: bit.ly/DCNApp

خطِ مشفق خواجہ بہ نام صدیق جاوید

مشفق خواجہ

پیدائش ۱۹۳۵ء۔ وفات ۲۰۰۵ء

تعارف مصنف: مشفق خواجہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام خواجہ عبدالحئی تھا۔ وہ ایک محقق، مرتب و مدوّن، شاعر، ریڈیائی و ادبی کالم نگار اور مکتوب نویس کی حیثیت سے اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کیا۔ مشفق خواجہ بہ حیثیت مدیر قومی زبان اور سہ ماہی اردو سے بھی وابستہ رہے۔ خامہ بگوش ان کا قلمی نام تھا۔ وہ ایک نامور محقق تھے، لیکن ساتھ ہی بہترین طنز نگار، کالم نویس اور نقاد تھے۔ مکتوب نگاری کی حیثیت سے مشفق خواجہ بغیر کسی بناوٹ اور سجاوٹ کے خط لکھتے تھے۔ جو دل میں ہے وہی قلم کی نوک پر ہوتا تھا۔ مشفق خواجہ کے خطوط میں ادب کے مختلف مسائل پر گراں قدر معلومات پائی جاتی ہیں۔ خواجہ صاحب کی مزاج کی شوخی ونکتہ طرازی اور نئی تراکیب وضع کرنے کی صلاحیت کا اظہار ان کے مکاتیب میں جابجا ہوا ہے۔ بعض خطوط میں سفر کی روداد کا ایسا دلکش اور بے ساختہ احوال ہے کہ عام قاری بھی اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مشفق خواجہ کی اہم تصانیف میں ان کے چار کالموں کے مجموعوں خامہ بگوش کے قلم سے، سخن در سخن، سخن ہائے گسترانہ، سخن ہائے ناگفتنی کے علاوہ ابیات (شاعری)، تذکرہ خوش معرکہ زیبا، غالب اور صفیر بلگرامی، کلیات یگانہ (ترتیب وتدوین)، تحقیقی مضامین پر مشتمل مجموعہ تحقیق نامہ شامل ہیں۔ خواجہ صاحب نے ریڈیو کے لیے مختلف موضوعات پر پچاس سے زائد فیچر بھی لکھے۔

الفاظ معنی

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مکرمی	میرے بزرگ۔ میرے لیے قابل احترام	ناسازیِ طبع	طبیعت کی خرابی
نواح	اردگرد کا علاقہ	آئینِ دوستی	دوستی کے اصول۔ دوستی کے طور طریقے
مخطوطات	ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں		

تعارف مکتوب الیہ: صدیق جاوید جالندھر میں یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا تو لائل پور (فیصل آباد) کے محلہ گرونانک پورہ میں قیام کیا۔ صدیق جاوید نے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۴ء میں پاکستان ماڈل ہائی اسکول سے کیا۔ صدیق جاوید کی علامہ اقبال کی طرف رغبت کا باعث ان کی نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" قرار دی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ایف اے کا امتحان اسلامیہ کالج لائل پور سے ۱۹۶۰ء میں پاس کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ادیب فاضل کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی

اور ۱۹۶۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو میں ایم اے میں داخلہ لیا۔ اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم کے دوران انھوں نے مطالعہ اقبال میں خصوصی دلچسپی لی اور علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ ایم اے کی ڈگری کے لیے مقالہ لکھا تو اپنا موضوع "بالِ جبریل کا تنقیدی مطالعہ" منتخب کیا۔ اس مقالے کی تحقیق کے دوران دانش اقبال ان کی رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی اور پی ایچ ڈی کرنے کا مرحلہ آیا تو انھوں نے اپنے مقالے کے لیے جو موضوع منتخب کیا وہ "فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ" تھا۔ مشفق خواجہ اور صدیق جاوید کے مابین مراسلت کی کتاب مرتب کی۔ مشفق خواجہ، صدیق جاوید کے خطوط کی تعریف کیا کرتے تھے۔ مشفق خواجہ کے دوسرے خطوط کے مجموعوں سے صدیق جاوید کو لکھے گئے خطوط کا رنگ و آہنگ مختلف ہے۔ "مراسلت مشفق خواجہ۔ صدیق جاوید" ادب میں ایک اہم خزینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ سبق: یہ اقتباس "خطِ مشفق خواجہ بہ نام صدیق جاوید" سے لیا گیا ہے۔

اقتباسات کی تشریح

(۱) "جھنڈیر کے میاں مسعود احمد کی لائبریری میں نے ۱۹۹۶ء میں دیکھی تھی جب میں بہاول پور گیا تھا۔ چوں کہ وقت کم تھا اس لیے سرسری نظر ڈال سکا۔ اس کے بعد سے میاں مسعود احمد صاحب کا مسلسل اصرار تھا کہ میں ان کے ہاں آؤں اور چند دن وہاں گزاروں۔"

تشریح: اس اقتباس میں صدیق جاوید کو خط کے ذریعے مشفق خواجہ جھنڈیر لائبریری کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ انھوں نے یہ لائبریری ۱۹۹۶ء میں دیکھی جب وہ بہاول پور گئے تھے۔ یہ لائبریری مسعود جھنڈیر ریسرچ لائبریری کے نام سے مشہور ہے جو میلسی سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر سردار پور جھنڈیر میں واقع ہے۔ مشفق خواجہ اپنے اس خط میں بتا رہے ہیں کہ وقت کم ہونے کی وجہ سے میں نے اس لائبریری کو صرف سرسری ہی دیکھا۔ خواجہ صاحب سے میاں مسعود احمد مستقل اصرار کرتے رہے کہ وہ ان کے یہاں چند دن گزاریں۔

(۲) "ہم چاروں ۲۰ کی دوپہر تک جھنڈیر میں رہے اور اس لائبریری کو دیکھتے رہے۔ یہ میاں مسعود احمد کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ایسی عمدہ ذاتی لائبریری شاید ہی کوئی دوسری پاکستان میں ہو۔ ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں اور پانچ ہزار سے زیادہ مخطوطات ہیں۔"

تشریح: اس اقتباس میں مشفق خواجہ کہہ رہے ہیں کہ ہم چاروں یعنی ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر، جعفر بلوچ اور مشفق خواجہ ۲۰ کی دوپہر تک جھنڈیر لائبریری میں رہے اور اس لائبریری کو دیکھتے رہے۔ یہ لائبریری ۱۸۹۰ء میں جھنڈیر کے ایک زمین دار ملک غلام محمد نے قائم کی۔ ۱۹۳۶ء تک اس میں ہزاروں کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ ملک غلام محمد کی وفات کے بعد یہ لائبریری ملک غلام محمد کے نواسوں میاں مسعود احمد اور ان کے بھائی میاں محمود احمد نے سنبھالی۔ یہ پاکستان کی نجی لائبریریوں میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ مشفق خواجہ کے مطابق اُس وقت تک لائبریری میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں اور پانچ ہزار سے زائد مخطوطات موجود تھے۔ مگر اب کتب کی تعداد تقریباً دو لاکھ ۳۵ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ یہ لائبریری قومی ورثہ کی حامل تاریخی لائبریری ہے۔

(۳) "ہم لوگ ایک روز بہاولپور بھی گئے۔ وہاں میرے ایک دوست سید احمد دفن ہیں۔ اس نواح میں آکر ان کی قبر پر فاتحہ خوانی نہ کرتا اور ان کے اہل خانہ سے نہ ملتا تو یہ آئینِ دوستی کے خلاف ہوتا"۔

تشریح: اس اقتباس میں خواجہ صاحب بہاولپور میں اپنے دوست سید سعید احمد کی قبر پر گئے۔ سید سعید احمد عمر میں خواجہ صاحب سے بہت چھوٹے تھے مگر بقول خواجہ صاحب کہ ان کی ذہنی عمر مجھ سے کہیں زیادہ تھی۔ علمی ذوق بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ بے حد مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ تقریباً خواجہ صاحب کے ان سے ۲۰ سال تک تعلقات رہے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ میں اتنے قریب آکر ان کی قبر پر نہ جاتا اور ان کے اہلِ خانہ سے تعزیت نہ کرتا تو یہ دوستی کے اصولوں کے خلاف ہوتا۔

(۴) "جھنڈیر والوں کی ایک بات لکھنے سے رہ گئی۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی لائبریری کو ایک علمی ادارے کی صورت دے دیں، جیسے دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے۔"

تشریح: اس اقتباس میں خواجہ صاحب صدیق جاوید کو لکھ رہے ہیں کہ جھنڈیر لائبریری سے متعلق ایک بات لکھنے سے رہ گئی وہ یہ کہ میں نے انھیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنی لائبریری کو دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسی حیثیت میں لے آئیں۔ دارالمصنفین علی گڑھ نے ایک دبستان کی شکل اختیار کرلی تھی۔ شبلی نعمانی اور ان کے شاگردوں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور دیگر رفقا نے اس ادارے سے اسلامی تاریخ، زبان و ادب، مذہب و معاشرت، سیاست و تعلیم وغیرہ پر اپنی بیش بہا تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کی عقل و دل کو متاثر کیا اور انھیں اپنے ماضی کے ورثہ سے محبت کرنا سکھایا اور حال سے دلچسپی پیدا کرنے اور خوش آئند مستقبل کی نشاندہی بھی کی۔ اس دبستان کا فیض آج بھی جاری ہے۔ یہ ادارہ دینی، علمی و ادبی خدمات انجام دیتا رہا ہے وہ اہل نظر کی نگاہ سے مخفی نہیں ہے۔ دارالمصنفین برصغیر میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم اردو زبان و ادب اور علم و فضل کا ایک اہم ترین ادارہ ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اس خط میں خواہش ظاہر کی ہے کہ جھنڈیر لائبریری بھی اسی طرز کا ادارہ بن جائے۔

مشق

سوال نمبر ۱: درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

(الف) مشفق خواجہ نے کسے خط تحریر کیا ہے اور کس مقصد کے تحت؟ مختصراً اپنے الفاظ میں بتائیے؟

(جواب) مشفق خواجہ نے یہ خط صدیق جاوید کے نام لکھا تھا، جس میں انھوں نے جھنڈیر لائبریری سے متعلق اپنے تاثرات لکھے ہیں۔

(ب) اس خط میں کتنی شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے؟

(جواب) خط میں مشفق خواجہ کے مخاطب صدیق جاوید ہیں۔ انھوں نے چھ زندہ شخصیات (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر، جعفر بلوچ اور میاں مسعود احمد) اور ایک مرحوم دوست (سید سعید احمد) کا ذکر کیا ہے۔

(ج) خط کا اسلوب کیسا ہے؟ واضح کیجیے۔

(جواب) خط کا اسلوب سادہ اور کسی قسم کے تصنع سے پاک ہے۔ تحریر میں دوستانہ علمی رویہ نظر آتا ہے۔

(د) **خط میں کون سی لائبریری کا ذکر کیا گیا ہے؟ اور کیوں؟**

(جواب) خط میں مسعود جھنڈیر لائبریری کا ذکر کیا گیا ہے کیوں کہ میاں مسعود احمد نے مشفق خواجہ صاحب کو اس لائبریری میں آنے کی دعوت دی تھی جسے مشفق خواجہ صاحب نے قبول کیا اور اپنے دوستوں کے ساتھ اس لائبریری کو دیکھنے گئے۔

(ہ) **دارالمصنفین اور جھنڈیر میں کیا بات مشترک ہے؟**

(جواب) دارالمصنفین اعظم گڑھ اور جھنڈیر لائبریری کی قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں کتب خانوں میں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں اور ہزاروں کی تعداد میں مخطوطات موجود ہیں۔

(و) **لائبریری میں موجود کتابوں سے استفادے کو صدقہ جاریہ کیوں کہا ہے؟**

(جواب) کتب خانوں میں موجود کتابیں تشنگانِ علم کی پیاس کو بجھانے کا کام کرتی ہے نیز ہر طبقہ کا فرد یہاں سے استفادہ کرسکتا ہے اس میں امیر اور غریب کی بھی قید نہیں جو لوگ علم کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ بنتے ہیں، کتب خانوں میں کتابیں عوام الناس کے استفادے کے لیے عطیہ کرتے ہیں اُن کے لیے اُن کا یہ عمل صدقہ جاریہ بن جاتا ہے۔

سوال نمبر ۲: **درج ذیل الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے:**

الفاظ	جملے
مکرمی	مکرمی، تسلیمات! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔
مفصل	پولیس کا کہنا ہے کہ اس واقعے کی مفصل رپورٹ اب تک نہیں ملی ہے۔
سرسری	تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ طاقتوروں نے کمزوروں کی رائے کو ہمیشہ کچلا ہے۔
اشتیاق	مزارِ حضرتِ اقبال پر حاضری کا ہمارا اشتیاق آج پورا ہوا۔
براہ راست	کئی ممالک اس پاک چین اقتصادی راہ داری سے براہِ راست استفادہ کرسکیں گے۔
ناساز	استادِ محترم ناساز طبیعت کے باعث چھٹیوں پر چلے گئے ہیں۔
استفادہ	ضرورت اس امر کی ہے کہ نوجوانوں کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔
صدقہ جاریہ	نیک اولاد کا عمل والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوتا ہے۔
تلافی	ماضی کی غلطیوں کی تلافی کرکے تعلقات بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔
آئین دوستی	مصیبت کی گھڑی میں، مَیں اگر آپ کے ساتھ کھڑا نہ ہوتا تو یقیناً یہ آئینِ دوستی کے خلاف ہوتا۔

سوال نمبر ۳: درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

(۱) مسعود احمد کی لائبریری دیکھی:

(الف) ۱۹۹۵ء میں (ب) ۱۹۹۶ء میں ✓ (ج) ۱۹۹۷ء میں (د) ۱۹۹۸ء میں

(۲) ہاشمی صاحب نے فون کیا:

(الف) فروری میں (ب) مارچ میں (ج) اپریل میں ✓ (د) مئی میں

(۳) جھنڈیر نام ہے:

(الف) جگہ کا (ب) ملک کا (ج) ذات کا (د) قبیلے کا ✓

(۴) دارالمصنفین ہے:

(الف) اعظم گڑھ میں ✓ (ب) وہاڑی میں (ج) بہاول پور میں (د) ملتان میں

(۵) لائبریری میں مخطوطات موجود تھے:

(الف) پانچ ہزار ✓ (ب) چھ ہزار (ج) سات ہزار (د) آٹھ ہزار

www.downloadclassnotes.com